مغربی جمہوریت
حقیقت اور سراب
www.KitaboSunnat.com
ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

بہ اشتراک
ادارہ نور سحر لاہور
بیت الحکمت لاہور

321.4
A891M

علوی، مستفیض احمد، ڈاکٹر

مغربی جمہوریت، حقیقت اور سراب

لاہور: ادارہ نور سحر و بیت الحکمت

۲۰۰۳ء: ۲۰۰ ص

۱۔ سیاسات۔ جمہوریت

ISBN 969-8773-02-9

کتاب : مغربی جمہوریت۔ حقیقت اور سراب

مصنف : ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : انتخاب جدید پریس، لاہور

قیمت : ۱۵۰ روپے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

کراچی میں ملنے کا پتہ
فضلی سنز سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی ۰۲۱:۲۲۱۲۹۹۱

فہرست مضامین

عنوانات | صفحات

باب چہارم:

جدید جمہوریت کا ارتقاء اور کارہائے نمایاں

باب پنجم:

جمہوریت کی کامیابی ...... حقیقت یا سراب؟

باب ششم:

جدید جمہوریت اور اسلامی اصول سیاست

انتساب

رُوحُ المقیم

بیٹے

اور

عیشہ راضیہ

بیٹی

کے نام

مقدمہ

آج کی ریاست سیاسی و معاشرتی انتشار کا شکار ہے۔ ایک طرف وہ اپنے لازمی فرائض یعنی امن وامان، عدل وانصاف اور بنیادی حقوق وغیرہ) کی بجا آوری میں ناکام نظر آتی ہے تو دوسری طرف، وہ افراد معاشرہ کو مساویانہ اور منصفانہ سہولیات زندگی، بہم پہنچانے میں بے بس ہے۔

بلاشبہ، ریاست کے ارتقاء نے انسان کی ضروریات زندگی مہیا اور سہل کرنے میں سنہری کردار ادا کیا ہے۔ انسانی زندگی پرآسائش اور خوشحال ہوئی ہے۔ مگر یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جدید ریاست کا نظام پیچیدگی اور الجھاؤ کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ انسان کی سماجی زندگی، معاشرتی انصاف اور عدل اجتماعی سے کوسوں دور جا پڑی ہے۔ کہیں افراد ریاست کے قابو میں نہیں، اور کہیں ریاست ایک دیو بن کر افراد کو کھارہی ہے۔ کسی ملک میں رعایا کا اعتماد، ریاستی اداروں سے اٹھ گیا ہے اور کہیں ریاست وحاکمیت کے ادارے عوام الناس کی بے حسی کا رونا رو رہے ہیں۔ سرمایہ داری کے نظام کی وجہ سے انفرادی معاشی آزادی نے ریاستوں کے اندر ریاستیں بنادی ہیں اور کہیں اشتراکی فکر کی بدولت ریاستیں افراد، کے نجی و ذاتی معاملات میں بے جا مداخلت کی مرتکب ہورہی ہیں۔ اس کا نتیجہ افراد میں بے یقینی واضطراب اور انتشار و افتراق کے ساتھ ساتھ، ریاستوں سے انسانی گروہوں کی بغاوت وعلیحدگی کی صورت میں ظاہر ہورہا ہے!

یہ سب کچھ ریاست کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ایسی صورت حال میں یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ انسان کے بنیادی مسائل کیا ہیں جن سے جدید ریاستی نظام عہدہ برآ نہیں ہوسکا اور یہ بھی کہ ان کا حل کیسے ممکن ہے؟

ان تمام مسائل کی وجہ پہلے تو یہ سمجھی جاتی تھی کہ چونکہ بادشاہت کی صورت میں یا اشرافیہ کی شکل میں ایک فرد اور ایک مخصوص طبقہ حکمرانی کے درجے پر فائز ہے اور جمہور کو اپنے معاملات سلجھانے کی آزادی یا حق نہیں دیا جاتا، لٰہذا یہ مسائل حل نہیں ہوتے۔مگر آج یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہو چکا ہے۔گذشتہ دو صدیوں سے جمہوریت کا بول بالا ہے۔لوگوں کی اکثریت اپنی حکومت بنانے میں شریک ہوتی ہے اور آزادی و مساوات اور حقوق انسانی کے لحاظ سے بھی آج کے دور کو بہت ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔اس کے باوجود اگر انسانی آبادیوں کے اکثر حصے بے چینی، بدامنی، ظلم اور افلاس کا شکار ہیں تو سوچنا پڑے گا کہ بنیادی مسئلہ کیا ہے جس کے حل ہونے سے امن، انصاف اور خوشحالی و خوشگواری کی منزل نصیب ہوسکتی ہے۔اور یہ کہ موجودہ سرابوں سے حقیقت تک پہنچنے کا راستہ اور طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟............

اگر یہ مانا جائے کہ انسان کا بنیادی مسئلہ معاشی ناہمواری ہے اور اس کا حل انسان نے موجودہ ریاستی اور جمہوری نظام کے ذریعے خود تلاش کر لیا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام سے لے کر کمیونزم تک، مختلف نظام ہائے معیشت اپنانے کے باوجود انسانی آبادی کا بہت بڑا حصہ بھوک کا شکار کیوں ہے؟............ایسا کیوں ہے کہ دنیا کے کچھ علاقوں میں اناج اور خوراک زائد ہونے کی وجہ سے سمندروں میں پھینک دی جاتی ہے اور کچھ علاقوں میں کروڑوں انسان بھوک اور قحط سالی کی وجہ سے مر رہے ہیں؟............یا یہ کہ ایک ریاست کے اندر ہی اس طرح کی دو انتہاؤں پر رہنے والے دو طبقات، خوشحال خطوں میں بھی کیوں پائے جاتے ہیں؟............اگر

اصل مسئلہ صرف آزادی، بنیادی حقوق اور سماجی تحفظات ہیں اور اس کا حل ایک مکمل، زندہ اور قابل عمل دستور یا قانون کی صورت میں ہوسکتا ہے، جو صرف جمہوری عمل کے نتیجہ میں حاصل ہوگا۔ ایسا ہے تو خود یورپی ریاستوں میں دور جدید کے پارلیمانی نظام اپنانے کے باوجود سماجی انارکی ختم کیوں نہ ہوسکی؟.......... میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) سے یو این او کے چارٹر (۱۹۴۵ء) تک، حقوق انسانی کے تمام منشور بے بس کیوں رہے ہیں؟.......... قوموں کی قومیں مجرموں میں تبدیل کیوں ہو رہی ہیں؟

اس سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو مرض کی تشخیص درست نہیں ہوئی یا پھر علاج درست نہیں ہو رہا۔ بے شک انسان کے اہم بنیادی مسائل معیشت، سماج، تعلیم اور اخلاق ہی ہیں مگر ان مسائل کا حل کسی جزوی تشخیص اور عارضی علاج سے وابستہ نہیں ہے، جو مرض کی ظاہری علامات دیکھ کر تجویز کیا گیا ہو۔ حقیقت میں انسان کے تمام بنیادی مسائل کا تعلق اس سوال سے ہے کہ اس دنیا میں انسان کا مقام، حیثیت اور مقصد زندگی کیا ہے؟.......... اس سوال کے جواب میں انسان ایک لائحۂ عمل طے کرتا ہے اور اسی سے اس کی خوشگواری اور ناگواری کے تمام راستے نکلتے ہیں۔

انسانی زندگی ایک زندہ جسم کی مانند ہے جس میں سارے اعضاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ کسی ایک میں خرابی اور بگاڑ، سب کو متاثر کرتا ہے اور مکمل صحت کے لئے سب کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ یہ اصول اور حقیقت، تسلیم نہ کرنے کی صورت میں انسانی زندگی مختلف حصوں میں بٹ جاتی ہے اور اجتماعی فلاح کا خواب، شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کے بنیادی طور پر چار پہلو ہوتے ہیں: نظریہ، عمل، اخلاق اور معاملہ۔ یعنی انسان کے عقائد و نظریات، ان عقائد کے مطابق ترتیب پانے والے رسوم و عبادات، ان اعمال کی بنیاد پر پرورش پانے والے اخلاق، اور ان اخلاقیات سے وابستہ اس کے دیگر

لوگوں کے ساتھ معاملات۔ان سب حوالوں میں بنیادی کردار عقائد کا ہے جو انسان اس کائنات میں اپنے مقام اور زندگی کے بارے میں قائم کرتا ہے۔انہی نظریات و ایمانیات پر پورے شجر زندگی کی صحت اور بیماری کا مدار ہے۔کیونکہ یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہے کہ انسانی زندگی دراصل عکس ہوتی ہے اس کی فکر اور سوچ کا۔انسان کا نظریہ زندگی ہی اس کے تمام اعمال پر حکمرانی کرتا ہے۔

اگر ایسا ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات میں انسانی مقام وحیثیت کے بارے میں صحیح ،مکمل اور قابل عمل نظریات کا حصول کیسے اور کہاں سے ہوسکتا ہے؟

ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان اپنے مقام اور حیثیت کے بارے میں خود فیصلہ کرے اور وہ اپنے ذرائع علم سے اخذ کردہ معلومات کی بنیاد پر اپنے مقام سے مطابقت رکھنے والا نظام حیات ترتیب دے۔لیکن اس میں ایک مشکل ہے۔وہ یہ کہ اس دنیا میں اگرچہ انسان کوئی ایک اختیارات و وسائل حاصل ہیں،مگر سارے نظام کی ساری چیزیں اس کے بس میں نہیں۔بے شمار کام ایسے ہورہے ہیں جو نہ صرف انسان کے ارادوں اور علم سے ماوراء ہیں بلکہ اس کی سوچ اور فکر کے دائروں سے بھی بہت دور،غیر متوقع اور تعجب انگیز ہیں۔

لہٰذا انسان نے جب بھی ان معاملات میں اپنے محدود ذرائع علم کے ذریعے ،حکم لگانے کی کوشش کی ہے،دھوکا کھایا ہے۔مثلاً وہ اپنے حواس کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کو،زندگی کے ابدی حقائق کے مقابلے میں لاتا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فکری وعملی انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔اسکی وجہ ہے کہ انسانی حواس بے شک بنیادی ذریعۂ علم ہیں مگر ان کی رسائی زندگی کے غیر مادی یا نظر نہ آنے والے حقائق تک نہیں ہوتی۔لہٰذا وہ ایسے معاملات میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔اہل علم ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حواس کے کچھ نقائص ہیں جن

سے مفر نہیں:

ا۔ یہ محدود ہیں کہ صرف محسوس کئے جانے والے حقائق کا پتا دیتے ہیں۔

۲۔ ناقابل اعتماد اور عارضی ہیں ان کے ضائع ہونے کا احتمال ہر وقت رہتا ہے۔

لہٰذا مابعد الطبیعاتی حقائق تو ان کے بس کا روگ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے حاصل شدہ علم کی بنیاد پر جو تہذیب و تمدن استوار ہوتے ہیں، کچھ بنیادی کمزوریاں ان کا خاصہ ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ غیر حسی حقائق (خدا اور آخرت) کا انکار ،جس کی بنیاد پر انسان غیر ذمہ دار، خود غرضی کا پتلا اور ذاتی مفادات کا پجاری بن جاتا ہے۔ حاضر کو غائب پر ترجیح دے کر خواہشات کا غلام بنتا چلا جاتا ہے۔ اگر اجتماعی نقطہ نظر جنم لے بھی، تو قوم پرستی تک محدود رہتا ہے۔

انسان کو جانور سے ممیّز کرنے والی خصوصیت عقل ہے، جس کے ذریعے انسانی علوم میں ترتیب و ربط پیدا ہوتا ہے، لیکن چند ثابت شدہ کوتاہیوں کی بدولت یہ نتیجہ بھی رکھتی ہے کہ تنہا، بنیادی مسائل حل کرنے میں ناکام ہے:

ا۔ عقل کے تمام کارناموں کی بنیاد، حواس کی فراہم کردہ معلومات پُر ہے، جو خود کمزور ذریعہ علم ثابت ہوئے ہیں۔

۲۔ عقل، انسانی خواہشات سے متاثر ہوتی ہے اور اکثر ان کی اطاعت میں لگ جاتی ہے۔

۳۔ عقل کے ذریعے، صرف محسوس کی جانے والی اشیاء کی ہی پیمائش ممکن ہے۔

۴۔ انسانی عقل کی کاوش و محنت کا نتیجہ، سائنس اور فلسفہ ہیں جن کی بنیاد پر خدا اور آخرت جیسے مابعد الطبیعاتی حقائق کے بارے میں فیصلہ کن حکم لگایا ہی نہیں جا

سکتا کیونکہ یہ ان کے میدان اور رسائی سے باہر ہیں، یہی وجہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفہ، ان حقیقتوں کے بارے میں خود کئی غیر عقلی اوہام کے پیرو کار تھے۔ بقول اقبال:

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے؟

یہ ثابت شدہ حقیقت فیصلہ کرتی ہے کہ انسان نے بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں غلطی کی ہے اور اس بنیادی کمزوری نے، اسے اپنا مقام متعین کرنے اور صحیح و درست نظام حیات (صراط مستقیم) حاصل کرنے میں ناکام رکھا ہے۔ لہٰذا بنیادی سوالات کے جواب اور بنیادی مسائل کے حل کے بارے میں اسے خالق کائنات سے رجوع کرنا پڑے گا اور ایسے ذریعہ علم اور ضابطۂ حیات پر انحصار کرنا پڑے گا جو اسے خالق کی مرضی اور خوشنودی سے وابستہ کردے تاکہ اس کو تخلیق کرنے والے کی طرف سے عطا کردہ نظام حیات اسے میسر آئے اور دین و دنیا کی سرفرازی اس کا مقدر ٹھہرے۔

اس صراط مستقیم کی طرف مفصل، مستند اور قابل عمل راہنمائی انسان کو خالق کائنات کے عطا کردہ علم وحی سے ہی میسر آسکتی ہے۔ یہ وہ نور ہے جو بیک وقت ذریعہ علم بھی ہے اور ذریعہ ایمان بھی۔ یہ عالم غیب کی وہ آواز ہے جس کے ذریعے انسان کو حقیقی علم، اس کائنات کے خالق کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ وہ جو کہ شک وشبہہ سے بالاتر اور یقینی ہے اور عملی زندگی کی ہدایات پر مبنی ہے۔ اس علم و عمل کی قدامت، صداقت اور مفاد عامہ، مسلم ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق و تائید انسانی عقل اور تجربے

نے بھی کی اور اس کے وجدان وضمیر نے بھی!

لہٰذا جب تک انسانی اجتماعیت اپنے خالق کے دیئے ہوئے نظام سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر لیتی، اس کے دکھ ختم نہیں ہو سکتے۔ تاریخ انسانی میں قوموں کی تباہی کا سبب بھی انسان کی یہی غفلت، لا پرواہی اور بے نیازی تھی، اور آج بھی معاشرتی ہولناکیوں کی وجہ، انسان کی اپنے رب رحمٰن کے ضابطۂ حیات سے بغاوت ہی بنی ہوئی ہے۔ آئے دن اس کے خطرناک حادثات سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز میں جذبہ قومیت سے سرشار انسانوں نے اپنی مرضی، اپنی عقل اور اپنی انا پر انحصار کرتے ہوئے، خود ساختہ نظریہ حیات کے تحت قومی ریاست میں عافیت تلاش کی مگر جلد ہی اس تصور کا نقصان پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴۔۱۹۱۹ء) میں نظر آ گیا۔ عصبیت کے پرستاروں نے انسانوں کی آبادیوں کو بیابانوں میں تبدیل کر دیا۔ اس سے گھبرا کر ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی مگر اس کا وجود بھی مثبت نتائج پیدا کرنے سے قاصر رہا، حتی کہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹۔۱۹۴۵ء) نے سات کروڑ انسانوں کو زندگی سے محروم اور معذور کر دیا تو ''اقوام متحدہ'' کا ادارہ معرض وجود میں آیا اور انسان نے ایک عالمی ریاست کے خواب کی تعبیر شروع کی۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسی عالمی ریاست کی بنیاد کیا ہو؟ وطن، زبان، رنگ یا نسل؟۔۔۔ یہ سب تو ریاست کی بنیاد بن کر حشر سامانیاں لائے!............ تو پھر آخر کونسا مرکزی نقطہ ہے، جس کے گرد معاشرے کے سیاسی گردش لیل ونہار قائم ہوں!

مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام؟ کہ جمعیت آدم!

تاریخ انسانی کے آثار قدیمہ کی بنیاد پر، سماجیات کے ماہرین کی طرف سے ، مذہب کو ریاست کی ابتداء اور اس کے ارتقاء میں بنیادی کردار کا حامل مانا گیا ہے مگر

مغرب کے جدید مفکرین ابھی مذہب کو ریاست میں مرکزی حیثیت دینے کو تیار نہیں ہیں تاہم وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست کی ابتداء نظریہ تخلیق ربانی کے مطابق ہوئی ہو یا معاہدہ عمرانی کے تحت.......... بہرصورت مذہب کے بنیادی کردار کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مذہب نے انسان کو ہم آہنگ اور یکسو کیا۔ اسے اتحاد اور یکجہتی سے مالا مال کیا۔ اعلیٰ اخلاقیات سے مزین کیا۔ اس کی فطرت کو پاکیزہ اور اس کے رویوں کو متوازن و متناسب بنایا، اور اس طرح اسے اشرف المخلوقات کے مقام پر متمکن کیا۔

مذہب نے جہاں فرد کی اصلاح کے ذریعے معاشروں کو تبدیل کیا وہاں ریاست کو ضابطۂ حکومت عطا کر کے افراد کی اصلاح اور فلاح کا ذریعہ بنایا۔ اس نظام تہذیب وتمدن کی کامل و اکمل صورت، دین اسلام ہے۔ جسے خدائے عز وجل نے انسانوں کے سامنے بہترین شکل میں، عملی ثبوت اور عملی نمونہ کے طور پر اپنے برگزیدہ، آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے مکمل کیا۔

نبی آخرالزمان ﷺ نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں جغرافیائی لحاظ سے ناف زمین، حجاز کی سرزمین سے اس روشنی کو پوری دنیا کے لئے پھیلانا شروع کیا اور مدینہ منورہ میں دس سال کی کاوش سے تقریباً ۱۵ لاکھ مربع کلومیٹر کی اسلامی ریاست قائم کر دی۔ آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کی براہ راست تربیت سے تیار شدہ افراد نے حضور ﷺ کے اختیار کردہ طریق کار کے مطابق، خلافت راشدہ کی صورت میں، اسلامی ریاست کا نظم جاری وساری رکھا جو تقریباً تیس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔

خلافت راشدہ (۶۳۲۔۶۶۰ء) کے تیس سال نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں ایک سنہری دور کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے.......... یہ اسلامی

فلاحی ریاست، بعد میں ایک ہزار سال پر محیط نظام تمدن کی بنیاد بنی، جو آج تک درخشندہ تہذیب کے طور پر بے مثال ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کا طویل اور وسیع نظم مملکت اگرچہ مثالی نہیں رہا.......... مگر اسلامی ریاست کے بنیادی خدوخال کو، جب بھی کسی مسلمان حکمران نے، خلافت کے اصول و نظم کے مطابق قائم کیا تو عروج کا سفر طے کیا اور جب انحراف ہوا تو اسلامی ریاست بکھرتی چلی گئی۔

خلافت کے علاوہ انسانی سماج نے بادشاہت اور جمہوریت کے طرز ہائے حکومت بھی دیکھے ہیں۔ یونان اور روم کی تاریخ کے ایک مختصر زمانہ کو چھوڑ کر عہد قدیم سے لے کر انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) تک اور بہت سے معاشروں میں، کسی نہ کسی صورت میں آج بھی، دنیا کا واحد نظام حکومت، ملوکیت یعنی بادشاہت رہا ہے۔ اس نظام حکومت کی بنیاد کبھی تو زبردستی اور طاقتوری بنی، کبھی وراثت اور دولت۔ جس نے ایک فرد کو اکثریت کی زندگیوں کا مالک بنائے رکھا۔ اس جبر کے ردعمل کے طور پر رعایا کی آزادئ فکروعمل نے ایک نئے نظام کو ترتیب دیا جو جمہوریت کے نام سے آج بھی مقبول ہے۔

جدید مغربی جمہوریت نے اپنے سفر کا آغاز انگلستان کی سرزمین سے تیرھویں صدی عیسوی (میگنا کارٹا ۱۲۱۴ء پارلیمنٹ ۱۲۴۰ء) میں کیا لیکن اپنی ارتقائی شکل، سترھویں صدی عیسوی (چارلس اول کی موت ۱۶۴۹ء، بنیادی حقوق کا اعلان ۱۶۸۹ء) اور اٹھارھویں صدی عیسوی (امریکی اعلان آزادی ۱۷۷۶ء اور انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء) میں اختیار کی۔

جمہوریت کے اس فکری اور عملی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ کہیں ریاست کے تمام شہریوں کی، براہ راست حکومت کا اصول اپنایا گیا اور کہیں بالواسطہ طور پر ان کی نمائندگی کا۔ بہرحال آزادی و مساوات کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ اس طرح جمہوریت بتدریج اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی اور تکمیل کی

طرف بڑھتی رہی۔ چنانچہ موجودہ دور میں سیاسی جمہوریت کے یہ مسلمہ اصول مانے گئے ہیں کہ آزادی وخودمختاری ہر قوم کا بنیادی حق ہے۔اور نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی، ثقافتی، مذہبی اور ذہنی آزادی بھی ہر فرد اور قوم کا بنیادی حق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے آغاز سے موجودہ زمانہ تک جمہوریت کے فروغ کی بے حد کوششیں ہوئیں مگر اب تک نہ تو جمہوری نظام کا کوئی مکمل نمونہ قائم کیا جا سکا ہے اور نہ ہی جمہوری افکار کو کسی قابل عمل پختہ فلسفے کے طور پر پیش کیا جا سکا ہے۔ لہذا جمہوریت آج تک ایک ادھورے خواب کی حیثیت رکھتی ہے، نا معلوم آنکھ کھلنے پر کیا سے کیا ہو چکا ہو!

مندرجہ بالا حقائق کی بنیاد پر یہ امر لازمی محسوس ہوتا ہے کہ دور جدید میں فرد اور ریاست کی اصلاح اور فلاح کے لئے ایک مکمل سیاسی نظام موجود ہو جس میں انسانی معاشرے کو فطری اور حقیقی بنیادوں پر استوار کیا جائے تا کہ انسان سکون وراحت کے ساتھ اپنے حقیقی نصب العین تک پہنچ سکے اور خالق کی اطاعت کے ذریعے مخلوق کو عظمتوں سے روشناس کروا سکے۔ ایسا اجتماعی نظام ترتیب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دور جدید کے جاری وساری، نظام حکومت وریاست کا تجزیہ کریں اور ضروری ہے کہ کسی قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر، غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے کہ دورِ جدید کے سیاسی مذہب، جمہوریت کے تحت ترتیب پانے والے طرزِ زندگی میں، سراب کہاں کہاں ہیں، اور حقیقت کی تلاش کہاں سے اور کیسے ممکن ہے؟

باب اوّل

جمہوریت کی حقیقت

اہل لغت کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں جمہوریت کا لفظ اپنے عربی ماخذ ''الجمهور'' کے لغوی مفہوم کی بنیاد پر معروف ہوا ہے۔اس کے معنیٰ ''اپنے ماحول سے بلند تر'' اور ''اکثریت'' کے ہیں۔ عام بول چال میں جمہوریت سے مراد''اکثریت (کی مرضی) کی حکومت'' ہوتی ہے اور یہ انگریزی زبان کے لفظ "Democracy" کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔یہ جمہوریت کا نظام کیا ہے؟..........اس سوال کے جواب سے قبل ضروری ہے کہ لغوی تحقیق کے ذریعے لفظ ''جمہوریت'' کا مفہوم متعین کیا جائے تا کہ اس فکری پس منظر سے آگاہی حاصل ہو جس کے تحت یہ اصطلاح ،ایک نظام حکومت کے طور پر عام ہوئی ہے۔

لغوی تحقیق

عربی لغت کے ماہرین کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت کا ماخذ...... لفظ ''جمهور'' ہے جس کا بنیادی مادہ ''جمهر" (ج،م،ہ،ر) بتایا گیا ہے۔

لسان العرب میں ہے:

جمهرت القوم: اذا جمعتهم ... ، جمهرت الشئ اذا جمعته۔(1)

فیروز آبادی لکھتے ہیں:

(1) ابن منظور:4/149

و جمهره، جمعه و القبر جمع عليه التراب و لم يطينه۔ (1)
مرتضیٰ زبیدی کے بقول: و جمهر ، أي الشئ : جمعه(2)
گویا جمهر کا بنیادی معنیٰ ہوا کسی چیز کا جمع ہونا یا اکثریت میں ہونا۔اسی
سے لفظ جمہور ترکیب پاتا ہے۔
القاموس میں ہے:
(الجمهور) بالضم، الرملة المشرفة على حولها۔(3)
صاحب لسان نے لکھا ہے:
الجمهور: و قال الاصمعى : هى الرملة المشرفة على ما حولها المجتمعة. الرمل الكثير المتراكم الواسع... الأرض المشرفة على ماحولها.(4)
مرتضیٰ زبیدی کے بقول:
و الجمهور: معظم كل شئ.(5)
اس کا مطلب یہ ہوا کہ الجمهور کا بنیادی مفہوم کسی چیز کی اکثریت اور اس کا ممتاز اور نمایاں ہونا ہے۔جمہور کا لفظ انسانوں کے لئے آئے تو اس سے ان کی اکثریت یا ممتاز اکثریت مراد ہوتی ہے۔جیسا کہ علمائے لغت نے بیان کیا ہے:
(الجمهور) ..... و من الناس ، جلهم.(6)
و جمهور الناس: جلهم، و جماهير القوم: أشرافهم. (7)
مرتضیٰ زبیدی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یوں بنتا ہے:

---

(1) القاموس:393/1 (2) تاج العروس:215/10
(3) فیروز آبادی،القاموس:ایضاً (4) ابن منظور،لسان العرب: ایضاً
(5) مرتضیٰ زبیدی: تاج العروس،ایضاً (6) فیروز آبادی:القاموس،ایضاً
(7) ابن منظور:لسان العرب،ایضاً

و الجمهور من الناس: جلهم و أشرافهم. و هذا قول الجمهور.(1)

لوئس معلوف کی المنجد اور المعجم الوسیط کے مصنفین کے مطابق ''جمهور'' کی جمع ''جماهير'' آتی ہے۔(2) جیسا کہ درج بالا عبارت کے الفاظ جماهير القوم سے ظاہر ہے۔ لفظ جمهور کے آخر میں حرف 'ة' کا اضافہ ہو تو اس کا مطلب مرتضی زبیدی کے بقول 'المرأة الكريمة' بنتا ہے۔ اسی طرح ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

و الجمهورة من الرمل: ما تعقد و انقاد، و قيل هو ما أشرف منه۔(3)

اسی طرح اس لفظ کے آخر میں یائے نسبتی کے اضافے سے اس کا معنیٰ ''المنسوب الى الجمهور'' کے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اکثریت کی چیز کو جمہوری کہا جائے گا۔ عربی میں 'جمہوری' ایک شراب کا نام بھی ہے۔ یہ نام پڑ جانے کی وجہ جمہوری کے لغوی معنی ہیں۔ جیسا کہ ابن منظور فرماتے ہیں:

و قيل له الجمهوري لأن جمهور الناس يستعملونه أي أكثرهم۔(4)

اسی لفظ جمہوری کی مؤنث ''جمهورية'' بیان کی گئی ہے۔ بطرس البستانی نے لکھا ہے:

الجمهورية مؤنث الجمهوري، و الألفاظ الجمهورية هي المستعملة من الجمهور۔(5)

مندرجہ بالا بحث کا نتیجہ نکلتا ہے کہ ''جمهور'' کا بنیادی معنیٰ اکثریت یا کثرت اور نمایاں یا بلند تر ہے۔ اور انسانوں کے حوالے سے جب یہ لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد عوام الناس یا ان کے معززین کی اکثریت ہوتی ہے۔ اسی مفہوم کے پیش

---

(1) تاج العروس: 10/215 (2) المنجد: 99، المعجم الوسیط: 137

(3) لسان العرب: 4/149 (4) ایضاً (5) المعجم الوسیط: ایضاً

نظر کتب اسلامی میں "جمہور" کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے جس سے مراد "معتبر علماء کی اکثریت" ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا عبارت میں علامہ زبیدی کے الفاظ " و ھذا قول الجمھور " سے ظاہر ہے۔ اسی طرح الماوردی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الأحکام السلطانیة میں یہ لفظ، امامت کے انعقاد کی شرائط کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فقالت طائفة لا تنعقد الا بجمهور أهل العقد و الحل من كل بلد.(1)

درج بالا تجزیئے سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ ایسی کوئی بھی چیز جو اکثریت سے منسوب ہو، جمہوری کہلاتی ہے، اور اسی سے لفظ "جمہوریت" ترکیب پایا ہے۔ گویا اسی بنیاد پر اکثریت کی مرضی کی حکومت وریاست جمہوریت کہلاتی ہے۔ اور یہ اصطلاح عربی سے اردو زبان میں استعمال ہونا شروع ہوئی ہے۔ جمہوریت کے لغوی مفہوم کی اس وضاحت کے بعد ہم اس کا اصطلاحی مفہوم جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصطلاحی مفہوم

الفارابی نے کتاب آراء اھل المدینة الفاضلة میں افلاطون (Plato) کی Republic کے لئے، عربی زبان میں متبادل لفظ "مدینه" استعمال کیا ہے جبکہ جمہوری حکومت کے لئے وہ "مدینة الجماعية" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بقول: مدينة الجماعية، هي التي قصد أهلها أن يكونوا أحرارا، يعمل كل واحد منهم ما شاء ۔(2) روزینتھال (Roscenthal) نے فارابی کے اس لفظ کو Democracy کے ہم معنیٰ کے طور پر لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Democracy (Madina Jamia'iya) is marked by the freedom of its citizens to do as they please.(3)

(1) الماوردی:6 (2) فارابی، آراء اہل المدینۃ الفاضلہ:110

(3) Poliltical Thought in Medieval Islam, p-136

اس سے جمہوریت کا اصطلاحی مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونے والی حکومت و ریاست ہے۔ عربی میں جمہوری حکومت کا ترجمہ ''حکم جمہوری'' سے کیا جاتا ہے۔(1) جبکہ ڈیموکریسی کو'' **دیمقراطیة**'' لکھتے ہیں جیسا کہ دائرۃ المعارف میں ہے:

جمهورية: ديمقراطية، و هي ما تكون بيد أكثر الأهالي۔(2)

اسی اصطلاحی مفہوم کے ساتھ ڈاکٹر حسن صعب نے جمہوریت کی یہ تعریف کی ہے:

و اذا كان الحكم لأكثرية الشعب كان المنتظم جمهوريا أو ديموقراطيا۔(3)

اسی طرح لوئیس معلوف کے مطابق ایسی سوسائٹی یا ریاست جمہوریت کہلا سکتی ہے جس کی حکومت کا انتخاب توارث کی بنیاد پر نہیں بلکہ عوام الناس کی اکثریت کی مرضی پر ہو............وہ لکھتے ہیں:

الأمة أو الدولة يعين زعيمها لوقت محدد لا بالتوارث بل بانتخاب جمهور الأمة۔(4)

اصطلاح جمہوریت کا لغوی مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اس کے متبادل انگریزی لفظ Democracy کا تجزیہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس لفظ کا وہ فکری پس منظر کیا ہے، جس کے تحت یہ اصطلاح عام ہوئی۔ اس تجزیاتی مطالعہ کے نتیجے میں جمہوری طرز حکومت اور جمہوری نظام کی خصوصیت سامنے آسکیں گی۔ اس سلسلے میں ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) کی تحقیق قابل غور ہے:

The word ' democracy ' came into English in the sixteenth

---

(1) بطروس البستانی، محیط المحیط: 126 (2) دائرۃ المعارف: 534/10

(3) علم السیاسۃ: 57 (4) المنجد: 99

century from the French demokratie, its origins are Greek, 'Democracy' is derived from demokratia, the root meanings of which are demos(people) and kratos(rule). Democracy means form of government in which in contradiction to monarchies and aristocracies, the people rule.(1)

(لفظ 'جمہوریت' انگریزی زبان میں سولھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سے آیا ہے جب کہ یہ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی زبان کے الفاظ 'ڈیماس' (یعنی لوگ) اور 'کراتوس' (یعنی حاکمیت) سے ماخوذ ہے۔ گویا جمہوریت سے مراد ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں بادشاہت اور اشرافیہ کے بالعکس، لوگ خود حاکم ہوں۔)

گویا یہ لفظ یونانی زبان سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ''لوگوں کی قوت'' ہے۔ یہ اصطلاح بادشاہت یا آمریت (یعنی ایک فرد یا چند لوگوں کی حکومت) کے مقابلے میں استعمال ہوتی ہے اور اس کا مفہوم ''عوام الناس کی حکومت'' ہے۔

الموسوعة العربية میں ہے:

ديمقراطية : كلمة مركبة أصلا من كلمتين يونانيتين، ديموس، أي الشعب، كراتوس، أي الحكم..........(2)

اسی طرح میکر یگر (Macgregor) اور جیک والٹر (Jack Walter) کی تحقیق کا خلاصہ واضح کرتا ہے کہ:

The word democratic is derived from two Greek roots, demos... the people and kratos. ...... authority, and in its political sense, democracy means government by the poeple ..The many ...as contrasted with government by the one...the monarch, the dictator... or by the few..(3)

رہا یہ سوال کہ یہ لفظ سیاسی اصطلاح کے طور پر کب سے اور کیسے مستعمل

(1) Models Of Democracy, p-1,2 (2) الموسوعة العربية الميسر ة:837

(3) Government by the People: p-33-34

ہوا؟......اس کا جواب جیمز میکریگر (James Macregor) اور والٹر (Walter) یوں دیتے ہیں:

The word came into English usage in the seventeenth century to denoto to direct democracy, the kind of government that existed in Athens and other Greek city-states(1)

گویا قدیم یونانی ریاستوں کے سیاسی نظام کی وضاحت کے ضمن میں یہ لفظ انگریزی میں سترھویں صدی عیسوی سے استعمال ہونا شروع ہوا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ولیم آف مور بکے William of Moerbeke نے ارسطو کی کتاب پالیٹکس Politics کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔اس کتاب میں عوامی حکومت کیلئے ارسطو کے استعمال شدہ لفظ (2) کا متبادل (یا ترجمہ) لاطینی میں 'Demokaratia' استعمال کیا گیا ہے جو بعد میں انگریزی میں آکر Democracy کی صورت اختیار کر گیا۔

جان ڈن (John Dunn) نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

The terminology only became central to European political discourse after William of Moerbeke ,translating Aristortle,s Politics into Latin, for the first time in the middle of the thirteenth century ,chose the word Democratia to translate (or rather, to transliterate)Aristotle,s term in Book 3 for the rule of the people.. (3)

لفظ جمہوریت اور Democracy کے بارے میں اس مختصر لغوی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں الفاظ اپنے لغوی روح کے لحاظ سے ''عوام الناس کی حکومت/حاکمیت'' پر دلالت کرتے ہیں۔بطور سیاسی نظریے کے یہ اصطلاحات یونانی

(1) Government By The People:p-33,34

(2) Politics(Tr. B. Jowett)Book-III, Ch:7, p-139

(3) Democracy-The Unfinished Journey:p-59

زبان و تاریخ سے ماخوذ ہیں اور جدید سیاسی زندگی میں ان کا استعمال گذشتہ دو تین صدیوں سے عام ہوا ہے جبکہ ''اردو زبان میں جمہوریت کی اصطلاح اٹھارہویں صدی سے مستعمل ہے''(1)

جمہوریت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت یا Democracy کا نظام ہے کیا؟

قدیم سیاسی مفکرین میں ہیروڈوٹس(Herodotus) افلاطون(Plato) اور ارسطو(Aristotle) نے عوام کی حاکمیت' (یعنی جمہوریت) کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں پر ارسطو کی اس عبارت کا حوالہ موزوں ہے جس سے موجودہ دور میں Democracy کے اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔

سبائین (Sabine) جیسے جدید ماہرین سیاسیات نے بیان کیا ہے کہ ارسطو کے بیان کردہ سیاسی فلسفے کے مطابق اچھی قسم کی حکومتیں تین طرح کی ہوتی ہیں:

(۱) بادشاہت(Monarchy) (۲) اشرافیہ(Aristocracy)

(۳) عمومیت (Polity) (جسے وہ سب سے اعلیٰ اور مثالی قرار دیتا ہے)

......اسکے بیان کے مطابق یہ تینوں جب بگڑتی ہیں تو صورتحال یہ بنتی ہے کہ بادشاہت جبریت یا (Tyranny) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اشرافیہ، مطلق العنانیت یعنی Oligarchy میں جبکہ عمومیت، عوامیت یعنی جمہوریت میں (2) یہی حوالہ بابیو (Bobio) یوں دیتا ہے:

"..government by the masses appears in its good form under the name of Politeia and in its bad form under the name of Democracy ." (3)

---

(1) اردو دائرہ معارف اسلامی (جامعہ پنجاب) 430/7

(2) Aristotle, ***Ibid***

(2) Sabine, A History Of Political Theory, p-110

(3) Bobio, Democracy And Dictatorship(Tr. Peter Kennealy)p-140

ارسطو کے اس نقطہ نظر کو بیان کر کے ولیم آف مور بکے نے جمہوریت کی درج ذیل تعریف کی تھی:

A form of government which is conducted for the benefit of the poor rather than in the public interest.(1)

گویا ارسطو نے حکومت کی بگڑی ہوئی شکل کو ''عوام الناس کی حکومت'' یعنی جمہوریت قرار دیا جبکہ ولیم نے اس سے محض لوگوں کی حکومت نہیں بلکہ ''غرباء کی حاکمیت'' مراد لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی امور کے قدیم وجدید ماہرین جمہوریت یا Democracy کی کوئی جامع تعریف متعین کرنے میں مختلف الخیال یا پھر ناکام نظر آتے ہیں، جیسا کہ ماہر سیاسیات نوبرٹو بابیو (Noberto Bobio) لکھتا ہے:

The entire history of political thought is riddled with disputes about the best form of government and within this dispute a recurrent theme has been the argument for and against democracy.(2)

تاریخ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسانی معاشروں کا قدیم ترین اور عملاً کامیاب ترین طرز حکومت بادشاہت رہا ہے۔ اس انداز حکمرانی میں جب مطلق العنانیت اور آمریت کا عنصر حد سے بڑھ گیا تو عوام الناس میں ردّ عمل پیدا ہونے لگا۔ رعایا کی اکثریت اور عوام الناس کی اہمیت نے آگے بڑھ کر ایک طرز حکومت کا روپ دھار لیا تو وہ جمہوریت یا Democracy کہلایا۔ اور اپنی ارتقائی منازل طے کر کے ''عوام کی منشاء کے مطابق حکومت'' کے طور پر مقبول ہوتا چلا گیا۔ یہ نظام افلاطون اور ارسطو جیسے مفکرین کی نظر میں قابل قبول نہ ٹھہرا کہ وہ اسے ''ہجوم کی حاکمیت'' قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ دراصل حکومت کی ناکامی ہے کہ عوام الناس یا رعایا تنگ آکر خود حکومت سنبھال لیں اور ایک نئی طرح کی بدامنی یعنی انارکی

(1) Jhon Dunn, ***Ibid***, p-59 (2) Bobio, ***Ibid***,p-138

(Anarchy) جنم لے(1)۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نہ صرف قدیم یونانی مفکرین سیاسیات بلکہ انیسویں صدی تک کے جدید سیاسی ماہرین ''عوام الناس کی حاکمیت'' کے تصور کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے جیسا کہ مائیکل سٹیورٹ (Michael Stewart) لکھتا ہے:

Untill the middle of the ninteenth century democracy was a smear word for mob-rule. Only in the last 100 years has it taken on a generally favourable meaning (2)

(انیسویں صدی کے وسط تک جمہوریت ایک بدنام لفظ تھا، جو ہجوم کی حکومت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔گذشتہ ایک صدی میں اس طرز حکومت نے عام پسندیدگی کا مفہوم اور مقام حاصل کرلیا ہے۔)

سیاسی تاریخ کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ جمہوریت اپنے ارتقائی مراحل میں جس شکل سے گذرتی رہی اسی حوالے سی اسکی مختلف تعریفیں اور نام بنائے جاتے رہے۔مختلف قوموں کے معاشرتی ومعاشی حالات نے ہر معاشرے کے اپنے خاص مزاج کے مطابق عوامی شرکت کے جس نظام حکومت کو بھی اختیار کیا وہ وہاں کی جمہوریت کہلایا۔اس معاشرے کے سوچنے سمجھنے والے دماغ جمہوریت کے اسی ماڈل کی خصوصیات کو اصل جمہوریت کے خدوخال کے طور پر شمار کرنے لگے۔حتیٰ کہ آج جب جمہوریت کی کوئی جامع تعریف کرنے لگےتو اسکے سامنے کئی عکس نمایاں ہوجاتے ہیں جنہیں وہ چند الفاظ میں مقید کرنے کو ناممکن محسوس کرنے لگتا ہے۔سارٹوری (Sartori) تو یہاں تک کہتا ہے:

We characteristically live, then,in an age of confused democracy. That'democracy' Obtains several meanings,is something we can live with. But if "democracy"can mean just

---

(1) Aristotle, Politics(Tr. B. Jawett) Book-III, Ch.7, p-139

(2) Michael Stewart, Modern Forms of Government, p-56

anything,that is too much. (1)

(گویا، واضح طور پر ہم، غیر واضح تصورِ جمہوریت کے دور میں رہ رہے ہیں۔لیکن اگر لفظ 'جمہوریت' کئی مفہوم رکھتا ہوتا تو گزارا چل سکتا تھا، یہاں تو المیہ یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی معنیٰ لیا جاسکتا ہے۔)

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ڈال (Dahl) نے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

Yet a term that means anything, means nothing. And so it has become with "Democracy", Which now.a.days is not so much a term of restricted and specific meaning as a vague endorsement of a popular idea...(2)

(بہر حال وہ اصطلاح جس کے کئی معانی ہوں، بے معنی ہوتی ہے۔یہی حال جمہوریت کا ہے۔یہ اصطلاح آج کل کسی مخصوص اور متعین مفہوم میں استعمال نہیں ہوتی، بلکہ ایک مبہم سی تائید ہے ایسے خیال کی کہ جو کسی طرح سے عام ہو گیا ہے۔)

اسی طرح میکر یگر اور والٹر کا تجزیہ یوں سامنے آتا ہے:

Democracy...like liberty , equality and justice...is hard to define ...it is a symbol that stands for certain myths, independent of objective content..(3)

(آزادی، مساوات اور انصاف کی طرح، جمہوریت بھی ایک ایسا لفظ ہے جس کی متعین تعریف بہت مشکل ہے۔یہ چند افسانوی خیالات کا مرقع ہے جو کسی محور اور ہدف سے آزاد ہیں۔)

لٰہذا کارل بیکر (Carl Becker) نے جمہوریت کے ارتقائی عمل پر یوں تبصرہ کیا ہے:

(1) Giovanni Sartori, The Theory of Democracy Revisited, p-6
(2) Robert Dahl, Democracy And Its Critics, p-2
(3) Government By The People, p-34

(Democracy is)"A kind of conceptual Gladstone bag,which,with a little manipulations, can be made to accomodate almost any collection of soial facts, we may wish to carry about in it".(1)

(یہ ایک تصوراتی چٹے بٹے کی ایسی تھیلی ہے جس کی ترتیب اور تنظیم میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ، تقریباً سارے سماجی حقائق کو سمویا جا سکتا ہے......اپنی خواہشات کے مطابق!)

گویا وہ تمام خوبیاں جو ہماری نظر میں نظام حکومت کو ایسی بہتری کی طرف لے جائیں جو لوگوں کی اکثریت کی منشاء کے مطابق بھی ہو اور مفاد میں بھی ہو ، جمہوریت کے دائرے میں داخل سمجھی جائیں گی۔

جمہوریت کی تعریفوں کے اس گورکھ دھندے میں ایک بات جو سب سے نمایاں اور سب میں مشترک نظر آتی ہے وہ حکومت میں عوامی منشاء کی شمولیت کا اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ماہرین سیاسیات کی طرح قدیم فلاسفہ بھی اس بات پر متفق تھے کہ جمہوریت عوام الناس کی مرضی کے تحت ہی معرض وجود میں آتی ہے۔ رونلڈ پیناک (Ronald Pennok) کے ریکارڈ کے مطابق:

Herodotus defined it as the "rule of the many" The OED defines it as"government by the people"... C.B.Macpherson,s statement that the aim of democracy is "to provide the conditions for the free development of human capacities and to do this equally for all members of the society"...(2)

اسی طرح رومی فلسفی، پولی بی ایس (Polybius) نے جمہوریت کی تعریف و تحسین اسی بنیاد پر کی کہ وہ افراد معاشرہ کی اجتماعی رضامندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور

(1) Modern Democracy, p-4

(2) Ronald Pennock, Democratic Political Theory, p-3, 5

اس طرح عوام خود اپنے حقوق کی نگہداشت کے قابل ہو جاتے ہیں:

The good form of popular government is democracy in which the people 'take on themselves the care of the public interest...(1)

حقیقت یہ ہے کہ افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) کی طرف سے جمہوریت کو ناپسند قرار دیئے جانے کی وجہ صرف جمہوریت کی اپنی خرابیاں نہیں بلکہ ان دونوں فلسفیوں کے اپنے دور کا ''مخصوص اور محدود'' سیاسی طرز فکر بھی ہے۔ جس کے تحت حکومت کا حق معاشی اور معاشرتی طور پر مراعات یافتہ ''شہری'' طبقہ کو ہی حاصل تھا جبکہ افراد معاشرہ کی اکثریت یعنی عوام الناس جن میں خواتین، غرباء اور غلام شامل تھے...... ''شہری'' کی تعریف سے ہی خارج تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورتحال میں کوئی ایسی حکومت جس میں دوسرے درجے کے یہ شہری اپنی مرضی کر سکیں، قابل قبول نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم جب شہری حقوق پر محدود اشرافیہ کی اجارہ داری ختم ہوئی تو حکومت میں عوام الناس کی شمولیت بڑھنے سے جمہوریت ارتقاء پذیر ہوئی۔ یوں اسکی مقبولیت کی بنیاد ہی عوام الناس کی سیاسی اہمیت اور ان کی حاکمیت کا اصول ہے۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) جمہوریت کی تعریف اسی لئے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپکو اکثریت کے حق میں بہتر ثابت کر چکی تھی۔ اسکے خیال میں:

It is a government in favour of the many and not the few,the law is equal for rich and poor alike and therefore it is a government of laws,...and liberty is respected both in private and in public life ...(2)

یہ طرزِ حکومت، چند لوگوں نہیں بلکہ کئی یا زیادہ لوگوں کے حق میں ہوتا ہے۔ چونکہ قانون غریب اور امیر سب کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے، لہٰذا یہ حکومت قانون کے مطابق چلنے والی حکومت ہوتی ہے۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی،

(1) Noberto Bobio,Democracy And Dictatorship , p-140
(2) *Ibid*, p-139

دونوں میں، آزادی مقدم رکھی جاتی ہے۔

گویا عوامی اکثریت کی حکومت میں شراکت اور ان کے حقوق اور عزت کا تحفظ، برابری کی سطح پر...... یہی جمہوریت کا وہ امتیاز ہے جو آج کے دور میں اسے پسندیدہ اصول حاکمیت بنائے ہوئے ہے۔ یہی اصول، جمہوریت اور Democracy کی اصطلاح کا ماخذ ہے اور روح رواں بھی اور یہی تصور جمہوریت کے ارتقاء کا ضامن ہے۔ لہٰذا آج کی جمہوریت بھی ایسے ہی فکری و عملی محاسن سے مزین ہے۔ میخائل سٹیورٹ (Michael Stewart) نے اس تصور کو عمل میں ڈھالنے کا یہ طریقہ بتایا ہے:

A complete democracy would consult all of its citizens upon all matters ...It gives the citizen not merely the sense of sharing in decisions,but actual opportunity to influence its substance.(1)

(ایک مکمل جمہوریت تمام معاملات، سارے شہریوں کے مشورے سے چلاتی ہے۔ یہ شہری کو نہ صرف فیصلوں میں شرکت کا احساس اور اعتماد دیتی ہے، بلکہ ایک حقیقی موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ معاملات کی اصل پر بھی قابل ذکر حد تک اثر انداز ہوسکیں۔)

جمہوریت کے ان نظری خواص کو عملی جامہ پہنانے کیلئے معاشرے میں ایک خاص طرح کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر جمہوری نظام کا تصور بھی محال ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو جمہوریت کو محض ایک تصور سے بڑھا کر ایک طرز عمل اور طرز زندگی میں ڈھال دیتی ہے۔ اس آئیڈیل تصور کے حصول کا امکان خاص طرح کے معاشی اور معاشرتی ماحول میں ہی نظر آتا ہے۔

جدید ماہرین سیاسیات کا کہنا ہے کہ وہ قوم جو شعوری طور پر (ذہنی، تعلیمی اور نظری اعتبار سے) بالغ ہوگی اور معاشی لحاظ سے مساوات اور خوشحالی سے آراستہ

(1) Michael Stewart, Modern Forms Of Democracy, p-56

ہوگی، جمہوریت کا گہوارہ بن سکتی ہے۔جس طرح کہ لاسکی (Laski) لکھتا ہے:

Democracy is not likely to grow in a nation close to the stravation line(1)

(جمہوریت کسی ایسی قوم میں پنپ نہیں سکتی جس کی معاشی حالت قحط کے قریب قریب ہو۔)

وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ جمہوریت کے ترقی پانے کا انحصار درج ذیل امور پر ہے:

With an educated and fairly prosperous electorate, without wide extremes in wealth, with relative freedom from class, religious or sectional antagonism, with a democratic historical tradition, with many private associations, and with other social institutions that buttress the principles and practices of democracy.(2)

گویا جمہوریت اپنی مثالی صورت میں ایسے معاشرے میں سامنے آئی گی جہاں ذیل کے عناصر ہم آہنگ ہوں گے:

۱۔ انتخاب میں اپنی رائے کا استعمال کرنے والے افراد پڑھے لکھے اور قدرے خوشحال لوگ ہوں۔

۲۔ دولت وثروت کے لحاظ سے ان کے درمیان تفاوت کی خلیج بہت زیادہ وسیع نہ ہو۔

۳۔ مذہبی، طبقاتی اور فرقہ وارانہ مخاصمت سے آزاد ہوں۔

۴۔ جمہوریت کی روایت انہیں تاریخ سے وراثت میں ملی ہو۔

۵۔ کئی ایک غیر سرکاری جماعتیں اور دوسرے سماجی ادارے کام کر رہے ہوں، جو جمہوریت کے اصولوں اور عملی تجربات کے ساتھ اس کے طریقۂ کار کو بھی

(1) H. J. Laski, An Introduction To Politics, p-48, (2)*Ibid*,p-52

ترقی دے سکیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ نظام جمہوریت جن مقاصد اور اہداف کے حصول کے لئے قائم ہوتا ہے وہی دراصل جمہوریت کی پیدائش اور نشو ونما کیلئے بنیادی خام مال کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا یہ ایسا پھول ہے جو ایک خاص طرح کے باغ میں ہی اگ سکتا ہے، خاص طرح سے تیار شدہ سرزمین پر!............ بہر حال جمہوری حکومت کا مقصد معاشرے کی عمومی زندگی کی خدمت کرنا ہے اور ان ناہمواریوں کو دور کرنا جو اس کی آزاد نشو ونما کے راستے میں حائل ہوں۔

آج کی جمہوریت جس طرز زندگی کی علمبردار ہے اسکے بنیادی عناصر کو اختصار کیساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) عوام کی بالادستی (Supremacy of People)

(۲) مساوی حقوق (Equal Rights)

(۳) شہری آزادی (Civil Liberty)

(۴) عوامی فلاح و بہبود (Welfare of the People)

گویا جمہوریت ایسے طرز حکومت کا نام ہے جو عوام الناس کی مرضی، منشاء کے ساتھ ان کی فلاح و بہبود کیلئے اس طرح سے ترتیب دیا جائے کہ شہریوں کی آزادی اور مساوی حقوق کو تحفظ حاصل ہو۔

حاصل مطالعہ

☆ جمہوریت کا لفظ عربی زبان سے ماخوذ ہے جسکا معنیٰ کسی چیز کا کثرت میں اور بلند یا نمایاں ہونا ہیں، اسلامی کتب میں جمہور کا لفظ نمایاں اکثریت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

☆ اصطلاح کے طور پر اکثریت کی مرضی کے مطابق قائم شدہ نظام حکومت کے لئے یہ لفظ انگریزی کے Democracy کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

☆ جمہوریت یا Democracy اپنے تاریخی تصور اور سیاسی نظام کے لحاظ سے یونانی تاریخ اور نظام سیاست سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مفہوم لوگوں کی (قوت) حاکمیت کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

☆ یہ نظام، قدیم یونانی ریاستوں میں اپنی اصل شکل میں موجود تھا جہاں ریاست کے تمام شہری حکومت میں شامل ہوتے تھے۔ تاہم شہری کی تعریف میں ایک محدود معزز طبقہ ہی شامل تھا، جبکہ خواتین اور غلام اس حق سے محروم تھے۔

☆ جدید سیاسی اصطلاح کے طور پر جمہوریت کا لفظ سولھویں سترھویں صدی عیسوی سے مقبول عام ہوا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے فکری اور عملی سطح پر اسے ناپسندیدہ نظام حکومت شمار کیا جاتا تھا۔

☆ سیاسی ماہرین جمہوریت کی کسی متعین تعریف پر متفق نہیں ہیں تاہم کوئی معاشرہ یا ریاست اپنے حالات کے مطابق اگر ایسا نظام حکومت ترتیب دے جس میں ایک فرد یا مخصوص طبقہ کی بجائے عوام الناس کی مرضی شامل ہو، جمہوریت کہلائے گی۔

☆ مثالی جمہوریت ایک خاص طرح کے معاشرے میں نشو ونما پا سکتی ہے جہاں عوام کو بہتر معاشی اور معاشرتی ماحول میسّر ہو۔ جو تعلیمی پسماندگی سے پاک اور سماجی مساوات سے مزیّن ہو۔

☆ جدید جمہوریت عوام کی بالادستی، ان کے مساوی حقوق، شہری آزادی اور عوامی فلاح و بہبود کے عناصر ترکیبی پر مشتمل ہے۔

باب دوم

جمہوری فکر و عمل کے ابتدائی نقوش

تاریخ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جمہوریت کی قدیم ترین صورت گروہی اور قبائلی نوعیت کی تھی۔ انسان کی سماجی ضرورت اور اس کے تمدنی شعور کے تحت قدیم معاشروں میں ایسی نمائندہ شخصیات ابھر کر سامنے آجاتیں جو ایک خاص علاقہ میں حکمران کی حیثیت اختیار کر لیتیں۔ اسی طرح معاشرے منظم ہو کر ریاستوں کی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ دنیا کے تمام مہذب علاقوں میں ایسی ''جمہوریت'' کے خاکے ملتے ہیں۔ تاہم آج کے جمہوری نظام کے مقابلے میں اسے ''آمریت'' ہی کی ایک شکل کہا جائے گا۔

عرب، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، افریقہ اور امریکہ کے قدیم قبائل اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان قبیلوں میں سردار اپنی صلاحیتوں، قوت یا وراثت کی بنیاد پر مقرر ہوتا تھا تاہم وہ عوام کی مرضی اور رضا مندی کے ساتھ ان کی فلاح و بہبود کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اسے انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مشورہ کی خاطر دانشمندوں اور بڑی عمر کے لوگوں کی ایک مجلس اس کی معاون ہوتی تھی جس میں اہم فیصلے کثرت رائے کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ فلپ حتی (Philip K.Hitti) نے تو عربوں کو پیدائشی طور پر جمہوریت پسند قرار دیا ہے۔ غالباً ان معنوں میں کہ وہ اپنی مرضی اور رضا مندی کے اظہار میں آزاد اور خود مختار ہوتے تھے:

The Arabian in general and the Bedouin in particular is a born democrat.(1)

(1) History of the Arabs, p-28

انسانی تاریخ کا وہ حصہ جس کی تحریری تفصیل ہمیں میسر ہے، میں جمہوری طرزِ حاکمیت کی ترقی پذیر صورت کا ایک نقشہ، شہری ریاستوں میں نظر آتا ہے جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے تقریباً ایک ہزار سال قبل کے عرصہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں معرض وجود میں آئیں۔ وسیع ہوتی ہوئی دنیا کے یہ ابتدائی حصے متمدن معاشروں کی طرف، طرز حکومت کے ارتقاء کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ یونان، اٹلی، افریقہ، ایشیا اور سرزمین عرب ایسی سینکڑوں شہری ریاستوں کی تاریخ سے مزین ہیں (1)

یہاں ہم فقط ان یونانی ریاستوں میں پرورش پانے والی سماجی فکر اور سیاسی نظام کا جائزہ لیں گے، جنہیں جمہوریت کے ابتدائی سفر کی تجربہ گاہیں شمار کیا جاتا ہے۔

ا۔ ابتدائی جمہوریت۔ یونان کی مثالی ریاستیں

یونانی ریاستوں سے مراد سسلی کے شمال مشرقی جزیرے یعنی بحیرہ روم اور بحیرہ آئجیئن کے کناروں پر پھیلی سینکڑوں ریاستیں ہیں جن کے وجود کا ثبوت دو ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے۔ یہ "آیونین" جزائر جو بعد میں "یونان" کہلائے، مائی سینین Mycenaen تہذیب کے وارث تھے۔ شمال میں ایشائے کوچک، مقدونیہ (بلغاریہ) البانیہ، اطانیہ، قرطاجنہ، سسلی اور کریٹ جنوبی یونان میں سپارٹا اور دیگر جبکہ وسط میں لیڈیا اور آٹیکا کی ریاستیں تھیں۔ آٹیکا کا صدر مقام، ایتھنز (Athens) یونانی تہذیب وفلسفہ کا مرکز بنا (2)

یونان کی یہ "مثالی" ریاستیں جمہوریت کے ارتقاء میں بنیادی سنگ میل کے طور پر یاد کیجاتی ہیں جس کی وجہ ان ریاستوں کا وہ نظام حکومت وحاکمیت ہے جس میں موجودہ جمہوری نظام کا ابتدائی خاکہ نظر آتا ہے۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر روحِ جمہوریت سے مراد عوام الناس کی مرضی کا حکومت اور حاکمیت میں شامل ہونا ہے تو، ان ریاستوں سے پہلے بھی دنیائے انسانی نے حکومت میں شراکت ومشاورت کے

(1)، (2) Ernest Barker, Greek Political Theory, p-30, 32

نظام مختلف ناموں سے وضع کیے رکھے ہیں۔ نظام بادشاہت میں بھی جن لوگوں کو حق رائے حاصل تھا اور جو شوریٰ عمومی میں حصہ لینے کے مجاز تھے، ان کو قرآنِ پاک نے ''مـــلاء'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ قرآن مجید میں ''بڑوں کی کونسل Council of Elders یعنی ''ملاء قوم '' کے اس ادارے کا ذکر کہیں صرف مشاورتی بورڈ کے طور پر آیا ہے جیسا کہ فرعون مصر کے دربار میں۔ اور کہیں فیصلہ کن حیثیت رکھنے والی انتظامیہ کے طور پر جیسے کہ ملکہ سباء کی ریاست میں (1)

شمالی میسوپوٹو میا کی قدیم سمیری تہذیب میں جس کا مرکز نینوا (Nineveh) تھا، جمہوری طرز کی آئینی بادشاہت قائم تھی جس میں باقاعدہ مجلسِ بزرگان تھی جو قوم کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی اور یوں عوام، حکومت میں شرکت سے فیض یاب ہوتے۔ حروفِ تہجی اور فن تحریر کی ایجاد، نہروں کا نظام، زرعی خوشحالی، تمدن کی ترقی، شہری زندگی کا رواج اور سرمائے کا استعمال اس قوم کے ہی امتیازات ہیں، جو ابتدائی تہذیبوں میں کسی کے حصے میں آئے (2) دریائے دجلہ وفرات کے کنارے آبادان ریاستوں میں اللہ کی طرف سے پیغمبر نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے جن کی تکذیب اور اللہ کی بغاوت کے ارتکاب پر یہ آبادیاں طوفان نوح کا شکار ہو کر کھنڈرات میں تبدیل ہوگئیں۔ (3)

جان ڈن (John Dunn) کے بقول یہ ریاستیں سیاسی اداروں کے ارتقاء کے حوالے سے بھی ابتدائی گہوارے کی حیثیت رکھتی تھی:

The Phoenicians in western Asia, had something comparable to the self-regulating City-State or polis of archaic and classical Greece. Since it is now agreed that the Greeks

---

(1) الزخرف:46، الشعراء:34، النمل:29، 23، 39، ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی:36

(2)Grane Brinton, A History Of Civilizations, p-6, (3)*Ibid*

took their alphabet and their methods of colonization, perhaps even the city state concept itself ,from the Phoenicians , We should be similarly prepared for the possibilty of Phoenician origins for some of the Greek political arrangement we most admire.(1)

(مغربی ایشیاء کی فونیشی قوم نے بھی خودکار نظام بلدیات اپنا رکھا تھا جو کہ قدیم یونانی شہری ریاست کے مماثل تھا۔ اب محققین کی متفقہ رائے یہ بن چکی ہے کہ یونانیوں نے ابجد کا اصول اور آبادکاری کے طریقے اور شاید شہری ریاست کا تصور بھی انہیں سے لیا تھا۔ ہمیں اس امکان کو ماننے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ یونانی سیاسی تنظیم کے وہ ادارے جو ہم سے دادو تحسین پاتے ہیں، انہیں فونیشی لوگوں کا تحفہ ہو سکتے ہیں۔)

تاہم یونانی ریاستیں دراصل ایسے نظام حکومت کی ابتدائی مثالیں ہیں جنہوں نے آگے چل کر جدید جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی۔ جیسا کہ ارنسٹ بارکر (Ernest Barker) کہتا ہے:

Political thought begins with the Greeks.(2)

اسی طرح کیتھ گراہم (Keith Graham) کی یاددہانی ہمارے سامنے ہے:

Democracy, We must remember, was the name of a type of political regime first durably established in the Greek City-State of Athens by the aristocrat Kleisthenesin 508/707Bc.(3)

(ہمیں یہ بات بہرحال یاد رکھنی چاہئے کہ جمہوریت اسی طرزِ حاکمیت و سیاست کا نام ہے جو پہلی دفعہ پائیداری کے ساتھ یونانی شہری ریاست، ایتھنز میں قائم ہوئی اور اس کا سہرا چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح کے سردار کلیس تھینیسین کے سر ہے۔)

---

(1) Democracy- The Unfinished Journey, p-2

(2) Greek Poliltical Theory, p-1

(3) The Battle Of Democracy, p-1

سیاسی تاریخ کے تجزیہ نگاروں (1) کے مطابق کریٹ (Crete) قدیم یونانی تہذیب کا پہلا مرکز تھا جس نے 2000 ق م میں مینوئی قوم کی ترقی سے عروج کا سفر شروع کیا۔ یہاں کی سیاسی حاکمیت قدیم پدرسری بادشاہی نظام سے آہستہ آہستہ نمائندہ حکومت کی طرف منتقل ہوتی گئی جسے جمہوریت کا ارتقائی سفر کہا جا سکتا ہے۔ بادشاہت (Monarchy) سے اعیانیت (Aristocracy) یعنی امراء کی حکومت اور پھر مجسٹریٹوں کی حاکمیت سے ''آگورا'' یعنی عوامی اسمبلی کی حکومت ترتیب پاتی گئی۔

اسی طرح سپارٹا، جزیرہ بلقان کا جنوبی علاقہ، اسے ڈاورین "Daorian" نسل کے نوآبادکاروں نے ترقی کی راہوں پر گامزن کیا، مگر مقامی باشندگانِ قدیم کو غلام بنا کر حقوق شہریت سے محروم کر دیا۔ پورا معاشرہ دو طبقوں ''شہری'' اور غلام "Helots" میں تقسیم تھا۔ محنت مشقت کا سارا کام غلاموں سے لیا جاتا اور ستم یہ کہ ان کے وحشیانہ قتل و غارت کو قابل فخر گردانا جاتا۔

سیاسی سطح پر منتخب اشرافیہ کی حکمرانی تھی جس کے سربراہ دو بادشاہ ہوتے تاکہ ایک دوسرے کی تحدید کر سکیں۔ بادشاہ کے ساتھ مجلس بزرگان ''جیروشیا'' مجلس شوریٰ کے طور پر کام کرتی جس کی رکنیت ساٹھ سالہ بزرگ شہریوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس مجلس کا انتخاب شہری اسمبلی ''حیلیا'' کرتی جس کے ممبران پانچ سو ہوتے۔ اسمبلی کی شرطِ رکنیت ۳۰ سال کی عمر تھی۔ اس ''مجلس پنج صد'' یا شہری اسمبلی کا اجلاس ہر مہینے ایک بار ہوتا جہاں کثرت رائے سے مختلف فیصلے ہوتے۔ عدالتی امور نمٹانے کے لئے، مجسٹریٹ یا ''مکھیا'' منتخب کیئے جاتے جو بے پناہ اختیارات کے مالک ہوتے تھے۔ عدالت میں بادشاہ کو بھی حاضر ہونا پڑتا۔ قانون کا احترام شدّ ومد کے ساتھ موجود تھا۔ (2)

سپارٹا (Sparta) کے شمال میں معدنی ذخائر سے مالا مال ریاست ایتھنز تھی

---

(1) & (2) Ernest Barker, Greek Political Theory, p-1,2,32-33, 39

جس کی آبادی تقریباً سوا تین لاکھ تھی، بشمول سوا لاکھ غلاموں کے۔ ایتھنز (Athens) کی آبادی سماجی اور سیاسی حقوق کے لحاظ سے چار درجوں میں بٹی ہوئی تھی:

(۱) اول درجے کے شہری، جو تمام قسم کے حقوق سے بہرہ مند ...... ووٹ، حاکمیت، فوج میں بھرتی؛ سب کچھ میں ان کے جیسی اجارہ داری کسی اور طبقے کو حاصل نہ تھی۔

(۲) تجار۔ غیر ملکی تاجر جو عرصہ دراز سے آباد تھے۔ شہری حقوق سے محروم مگر دوسرے درجے میں اثر ورسوخ کے حامل، خوشحال لوگ تھے۔

(۳) ''آزاد غلام'' ...... ملازمت یا کاروبار سے منسلک طبقہ۔

(۴) غلام: جن پر معیشت کا انحصار تھا، محنت ومشقت، تعمیرات، مزدوری، جہاز چلانا، گھریلو خدمت، اور جسمانی مشقت کے سارے کام کرتے تھے۔ ایک ایک شہری کے کئی کئی غلام، باقاعدہ، خرید وفروخت کا مال!

سیاسی حاکمیت کا سہرا، فکر معاش سے آزاد، اول درجے کے شہریوں کو حاصل تھا، جن کی پرمسرّت معاشرتی زندگی ...... سیاست، فلسفہ، شاعری، تفریحی ڈرامے (طربیہ والمیہ) اور خطابت جیسے فنونِ لطیفہ سے معمور تھی جبکہ جسمانی ورزش شہسواری اور تیراکی وغیرہ کے ذریعے وہ اپنی صحت وتوانائی کا اہتمام کرتے۔ شہری حقوق صرف ایسے ''مرد شہریوں'' کے لئے مخصوص تھے۔(1)

سیاسی اقتدار کا سرچشمہ مقدس اسمبلی (Areopsagus) تھی جس کے رکن ایسے سابق ''آرکن'' (بادشاہ کا متبادل جمہوری ارتقائی عہدہ) بن سکتے تھے جو اپنے عہدہ کے ایک سالہ مدت پوری کر چکے ہوتے۔ انتظامی اور عدالتی امور کی کنجی کئی سالوں کے ارتقائی سفر کے بعد آخر کار عوامی اسمبلی (Eclesia) اکلیشیا کے حصہ میں

(1) See for details: John Dunn, Democracy, p-23

آئے۔عوامی اسمبلی کا اجلاس بلکہ جلسہ عام ہر روز ہوتا جس میں اس دن کے لئے قرعہ اندازی کے ذریعے مجلس کا انتخاب ہوتا۔ یہاں ہر شہری کو اظہار خیال کرنے، قرار دادترمیم پیش کرنے اور منظور یارد کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہ مجلس حکومتی عہدیداروں کا تقرر کرتی اوران کا مواخذہ بھی۔ داخلی وخارجی امور سے متعلق معاملات اسی مجلس عام میں زیر بحث آتے۔(1)

''مجلس پنج صد'' کو حکومتی مشینری کی حیثیت حاصل تھی جس میں ہر دس قبائل کے پچاس پچاس ارکان قرعہ اندازی سے چنے جاتے۔اس ایوان کی رکنیت ایک سال کے لئے ہوتی اور ہر سال قرعہ اندازی سے انتخاب عمل میں لایا جاتا، ہر روز اجلاس ہوتا جس میں چوبیس گھنٹوں کے لئے صدر اجلاس کا انتخاب قرعہ اندازی سے کیا جاتا۔ ممبران کو یومیہ معاوضہ بھی ملتا۔تمام ریاستی انتظامی امور، اس مجلس کے ذمہ تھے، تاہم پالیسیوں کی توثیق عوامی اسمبلی، اکلیشیا کرتی۔مختلف امور کے لئے عارضی اور مستقل کمیٹیاں بنائی جاتیں، جبکہ حکومتی انتظام، نو شعبوں میں منقسم تھے، جن کے سربراہ ''آرکن'' کہلاتے۔ان میں سے ہر ایک، ایک سال کے لئے حکومت کا صدر یا سربراہ منتخب ہوتا۔ان کا انتخاب بھی قرعہ اندازی سے ہوتا جبکہ فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کا انتخاب اسمبلی کے ووٹوں سے ہوتا تھا۔عدالتی امور''ہیلیا'' یا عوامی عدالت کے ذمہ تھے، جس کے ہزاروں ممبران ہوتے جو عموماً قانون سے نابلد تھے مگر حکمرانوں کا مؤاخذہ کرسکتے تھے۔(2)

مذکورہ بالا سیاسی اداروں کی نشوونما کی بدولت یونانی تہذیب انسانی تاریخ میں سیاسی شعور وآگہی کے مآخذ کے طور پر اور جمہوری رویوں کی آبیاری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔تاہم اس مقام تک آنے میں جس طرح کے کٹھن حالات سے

(1) See for details: Jhon Dunn, Democracy, p-23,
(2) See for details: E. Barker, Greek Political Theory, p-39

اسے دو چار ہونا پڑا، وہ انسان کی معاشرتی اور سماجی تاریخ کا اہم موڑ ہیں۔ شاہی حکومت، جاگیرداری نظام، مزارعت، عسکری ذہنیت، جمہوری معاشرے، طبقاتی نظام، معاشی نظام، اور ذہنی تعیشات...... اس سفر کی چند اہم جھلکیاں ہیں۔ کبھی نیم شاہی اور کبھی نیم پنچائتی نظام، کبھی اشرافیہ کا طبقہ حاوی اور کبھی دیوتاؤں کی پوجا، کبھی امراء کی منصفانہ حکومت اور کبھی چند سری جابریت...... غرضیکہ مدت ہائے دراز تک یونان کی ریاستیں آنے والے جمہوری نظام کی ''لیبارٹیری'' کے طور پر کام کرتی رہیں۔ جہاں بادشاہت کی جگہ عوام کی نمائندہ حکومتوں کے قیام کے باوجود بھی عورتوں اور غلاموں کا انبوہ کثیر...... جو ''شہریوں'' کے مقابلے میں کسی ریاست میں پانچ گنا اور کسی میں دس گنا تھا...... بنیادی شہری حقوق سے محروم رہتا جبکہ سیاسی حاکمیت اور شہریت کے حقوق سے فیض یاب آبادی کا ایک محدود اور مخصوص طبقہ ہی رہا۔ اسی لیے ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) نے یونانی جمہوریت کو سرداروں کی جمہوریت قرار دیا ہے:

Ancient democracy was the democracy of the patriarchs.(1)

نامعلوم ایسی حاکمیت کو عوام کی حکومت یا جمہوریت کیسے کہا جا سکے کہ جس میں بنیادی حقوق ہی ایک مخصوص اشرافیہ کو حاصل ہوں اور شہریوں کی اکثریت بھیڑ بکریوں کی سی زندگی گذارتی ہو! اس لیے اسے ''شہریوں کی استبدادیت'' (Tyranny of citizens) کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔(2)

ب۔ فکروشعور کی نئی جہتیں۔ فلاسفہ کے سیاسی افکار

یونان کی تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح ایک بحرانی صدی تھی۔ اس صدی کے اوائل واواخر میں جنگ کے ماحول نے بالخصوص یونان کو اقتصادی اور سیاسی بحران

(1) Models of Democracy, p-23 (2) *Ibid*, p-24

میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دوران میں فارس کی مطلق العنانی اور یونانی خود مختاری میں زبردست تصادم رہا۔ داخلی نظری محاذ پر دو فکر متصادم تھے یعنی ایک طرف سپارٹا کی جنگجوئی اور دوسری طرف ایتھنز کی جمہوریت! مگر اس کشمکش نے یونانی فکر کو مزید جلا بخشی۔(1)

اس دوران میں فلسفیوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوا جسے سوفسطائی (Sophists) کہا جانے لگا۔ عبوری دور کے یہ نمائندہ فلسفی، مسلمہ سچائیوں اور انصاف کے عمومی پیمانوں کو بے حقیقت سمجھتے تھے، ان کے نزدیک ریاست ایک دھوکہ، قانون ایک قید اور سیاست ایک جبر کا نام تھا۔ تاہم وہ لوگ غلامی کے خلاف اور انفرادی آزادی کے حق میں ایک پر زور تحریک کے بانی ٹھہرے۔(2) ان کے افکار کا مرکز و محور فرد کی ذات اور انفرادی زندگی تھے۔ ان کے خیال میں صحیح اور غلط کا معیار خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ وہ نکتہ نظر ہے جو صدیوں بعد یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) میں بھی لبرلزم (Liberalism) کی تحریک کا روح رواں بنا۔

Man is the measure of all things ... things are for each man what they seem to each man.(3)

یونانی فلسفہ کا دور عروج اگرچہ سقراط، افلاطون اور ارسطو سے وابستہ ہے مگر ان سب کا باوا آدم فیثا غورث (Pythagoras) معلوم ہوتا ہے جس نے چھٹی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ایک صحت مند معاشرے کی بنا، اپنے شاگردوں کے مخصوص کلچر کے ذریعے رکھ دی تھی۔ اس میں اعلیٰ اخلاقیات، نظم وضبط، آپس میں خیر خواہی، مساوات اور عورت کے احترام جیسے سنہری اصولوں کی تعلیم دی جاتی (4)

۳۲ سال سیاحت میں گذارنے والا یہ فلسفی سائنس دان، ہندستان کے

---

(1)،(2) صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی۔ مشرق ومغرب:35،37

(3) Ernest Barker, Greek Political Theory, p-70,

(4) E. Zeller, Out Lines Of the History of Greek Philosophy, p-100

معلم اخلاق مہاتما بدھ کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ ممکن ہے اس کی ملاقات پیغمبران خدا موسیٰ علیہ السلام اور دانیال علیہ السلام سے بھی ہوئی ہو!

''زمین گول ہے'' کا مقولہ دینے والا یہ مفکر 'عدد' یا، ہندسہ، کو کائنات کی اوّلین حقیقت قرار دیتا رہا(1) یونان کے طبقاتی معاشرے میں مساوات انسانی کا بیج بونے والا یہ فلسفی، شہری حقوق سے محروم عورت کے احترام جیسے 'جمہوری' یا 'پیغمبرانہ' رویّوں کا بانی معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی سیاسی اخلاقیات کا معلم سقراط (Sacorates) تھا جسے ایتھنز کی دولت پرست اشرافیہ برداشت نہ کر سکی۔ جو نوجوانوں کو شعور و آگہی کے زیور سے مزیّن کرنے اور قواعد و ضوابط کا پابند سپاہی بنانے میں اتنا متحرک تھا کہ تعلیم بھی چلتے پھرتے دیتا تھا۔ مشائی فلسفہ (Peripetatic Philosophy) کا بانی یہ برہنہ پا قلندر 'خود آگاہی اور تزکیہ نفس (Self-Purification) کا پیامبر تھا، جو سیاسی و شہری فریب کاری کا پردہ چاک کر گیا۔ بقول بارکر(Barker):

He died because he was supposed to be dangerous to thepoltitical order of the state; but since that order was bound up with a formal worship of civic gods, he was also accused of being an enemy of that worship.(2)

(وہ اس لئے موت سے ہمکنار ہوا کہ اسے مذہبی وسیاسی نظام ریاست کے لئے خطرناک سمجھا گیا۔ چونکہ یہ نظام شہری دیوتاؤں کی رسمی عبادت کے ساتھ بندھا ہوا تھا، لہٰذا سقراط کو اس 'عبادت' کا دشمن بھی سمجھ لیا گیا۔)

افلاطون(Plato:427-347.B.C.) سقراط کا شاگرد، جو پچاس سال تصنیف کے میدان میں رہ کر دنیا کی پہلی خیالی ریاست (Utopia) کا نقشہ دے

(1) Brian R. Nelson, Western Politial Thought, p-6

(2) Ernest Barker, *Ibid*, p-109

گیا۔"Republic"یعنی"مملکت یا جمہوریہ"اس کے سیاسی افکار کا شاہکار ہے اگر چہ The Statesman اور The Laws کے مکالمات میں بھی سیاسی خیالات ہی پیش کیے گئے ہیں مگر"جمہوریہ"اس سلسلہ میں افلاطون کی سب سے بڑی اور اہم کتاب ہے۔

افلاطون نے دراصل اپنے دور کی یونانی ریاستوں کی سیاسی ہیئت اور سماجی نقشے کو سامنے رکھ کر تجزیاتی فلسفہ حکومت و ریاست پیش کیا ہے۔اس کے مطابق یونان میں پانچ قسم کی حکومتوں کا رواج رہا ہے۔(i) بادشاہت(Monarchy) (ii) اشرافیہ (Aristocracy) (iii) چندسری مطلق العنانیت(Oligarchy)(iv) عوامی حکومت(Democracy)(v) جبریت(Tyranny) (1)

اس کے خیال میں بادشاہت بدل یا بگڑ کر اشرافیہ یعنی چند آدمیوں کے آمر طبقے کی شکل میں کارفرما ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ مطلق العنانیت کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔اس کے ردعمل کے طور پر عوام کی اکثریت کی حاکمیت شروع ہو جاتی ہے ۔اس طرز حکومت کو وہ سخت ناپسند کرتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں، غیر تربیت یافتہ عوام کی حاکمیت سے ریاست انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور حالات کا یہ بگاڑ آمریت یا استبدادیت کا باعث بن جاتا ہے۔ وائزر (Wiser) کے بقول، افلاطون عوام کی آزادی کو ہی سیاسی اقدار کا عروج نہیں سمجھتا تھا، نہ ہی اکثریت پرستی کے اصول پر قائم کسی"جمہوریت"کے نظام پر اسے کامل اعتماد تھا:

He does not believe that liberty is the ultimate political value, nor does he absolutely trust in the process of majoritarian democracy.(2)

تجزیہ نگاروں کے بقول افلاطون کی خیالی ریاست کے تین بنیادی عناصر یہ

---

(1) See for details: The Republic, (Ibid), 8/546

(2) James Wiser, Political Philosophy, p-18

ہیں: حاکم، فوج اور کاشتکار و دستکار۔ بیس برس کی عمر تک ہر شہری کو تعلیم دی جائے اور بیس برس کے بعد امتحان ہو، ناکام ہونے والوں کو تجارت، محنت، دستکاری و کاشتکاری پر لگا دیا جائے۔ جو نوجوان کامیاب ٹھہریں انہیں مزید دس سال تعلیم دی جائے۔ دوسرے امتحان میں ناکام ہونے والے محافظین (فوجی) قرار پائیں اور کامیاب ہونے والوں کو پھر فلسفہ، منطق اور سیاست کی تعلیم دی جائے۔ ان میں سے پچاس برس کو پہنچنے والے فلسفی حکمران بنیں۔ افلاطون کے مطابق ایسے حکمران نوع انسانی کے دکھوں کا مداویٰ کرنے والے مثالی حکمران بن سکیں گے۔ ان میں سے ۳۷ اشخاص کی ایک مجلس، قانون کے محافظین کے طور پر کام کرے۔ ستر برس کے ہو جانے والے کنارہ کش ہو جائیں۔ ۳۶۰ افراد کی ایک مجلس انتظامی ہو جو ریاست کے تمام امور کی نگرانی و انتظام کرے۔ ان اداروں کے انتخاب میں شہریوں کی تمام جمعیت حصہ لے تاکہ انصاف کے نفاذ میں تمام شہریوں کی رائے شامل ہو سکے۔ ریاستی اداروں میں سب سے اعلیٰ درجے پر دس معمر ترین افراد اور دس کم عمر نوجوانوں پر مشتمل ہو، جس کا اجلاس روزانہ سحر اور طلوع آفتاب کے دوران میں ہو اور یہ مجلس آئین سازی کا کام کرے (1)

سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو افلاطون کی ریاست میں خاندان کے نظام کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ املاک اور بیویوں کے اشتراک پر یقین رکھتا ہے۔ ''عارضی شادیاں'' اور ''صحت مند بچے''۔ مرد و عورت کے تعلق کے بس دو ہی مظاہر ہونے چاہئیں۔ اس کے خیال میں بچوں کی ملکیت کا احساس والدین کو ریاست کی خدمت سے باز رکھتا ہے اور اپنے خاندان کی طرف متوجہ رکھنے کی بنیاد بنتا ہے۔ لہٰذا سارے بچے ریاست کے ہوں اور وہی ان کی پرورش کرے۔ ''انفرادی اولاد'' کی جگہ ''اجتماعی اور ریاستی اولاد'' ہونی چاہیے تاکہ سارے لوگ ریاست کی خدمت کو ہی اپنی اولاد کی

(1) See for details: The Laws VI, Ch-12, p-576, Brian R. Nelson, Western Political Thought, p-23-50, Ernest Barker,Greek Political Theory, p-209-215

خدمت اور پرورش سمجھیں۔ یوں ان کی معاشرے کے ساتھ وابستگی استوار رہے گی:

It is essential that the parents should not know their children, or the children their parents. In this way only can universal-brotherhood ever become a fact.(1)

(یہ ضروری ہے کہ والدین اپنے بچوں کو اور بچے اپنے والدین کو نہ جانتے ہوں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمگیر بھائی چارے کا تصور حقیقت بن سکے گا۔)

یہ ہے افلاطون کا مثالی انصاف اور فلسفیانہ سوشلزم...... جو پہلی ناانصافی تو یہی کرتا ہے کہ کسی مرد کی کوئی بیوی نہ رہے اور، کسی بیوی کا کوئی خاوند! سب عورتوں کے سارے خاوند۔ انسانی نسلوں کی شناخت گم کرنے کا اس سے زیادہ سادہ اور ''منصفانہ'' طریقہ اور کیا ہوگا؟...... حیرت ہے کہ مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرنے والے فلسفی نے معاشرے کی بنیادی اکائی کے بغیر، مربوط اجتماعیت کا خواب کیسے دیکھا؟ اولاد کی اپنائیت اور ملکیت کے حق سے محروم شہری کی باقی وابستگیاں کس دلچسپی اور جذبے کے تحت باقی رہیں گی؟ جب ان کی ساری تگ و دو کے فطری محرک ہی دم توڑ جائیں گے!

ارسطو(Aristotle): معلم اوّل کہلانے والا سکندر اعظم کا یہ استاد ایک محتاط، متوازن اور منطقی اندازِ فکر کا علمبردار فلسفی تھا۔ اگرچہ ارسطو نے لاتعداد قیمتی کتابیں لکھیں مگر اس کی شاہکار ''سیاست (Politicke)'' کا ذکر یہاں ہوگا۔ اس کا ایک حصہ ریاست کی نوعیت، اس کے آغاز اور اندرونی تنظیم سے متعلق ہے، دوسرا حصہ اس دور کی ریاستوں کے نظاموں کا جامع تجزیہ ہے جبکہ تیرا حصہ ایک مثالی ریاست کی نقشہ گری کرتا ہے۔ باقی کتاب آئین اور انقلابات کے سیاسی وسماجی نظریات سے مزیّن ہے۔(2)

---

(1) See for details:Henry Thomas, Great Philosophers, p-65

(2) See for details:Poilitics I, Ch.1, 2, 13, p-76, 77, The Laws VI, Ch. 12, p-576, Henry Thomas, Great Philosphers, p-12, G. Lloyed, Aristotle- The Growth And Structure Of His Thought, p-4

ارسطو کے خیال میں ریاست ایک قدرتی ادارہ ہے جو انسان کے بہترین مفاد میں کام کرتا ہے۔ یہ ایک کمیونٹیKoimonia ہوتی ہے جس میں افراد" انسانی ضروریات پر مبنی انسانی وابستگیوں کے وسعت پذیر دائرے" بناتے ہیں۔

افلاطون کے برعکس ارسطو کے خیال میں عورتوں اور بچوں میں اشتراک، مسلسل غلط فہمی، جرم اور فساد کا باعث ہوگا جو چیز ہر شخص کی ملکیت ہو اس کی پرواہ کوئی نہیں کرتا۔ اجتماعی ذمہ داری کے معنی، انفرادی غفلت کے ہیں۔

What every body owns, nobody cares for (1)

ارسطو کے خیال میں افراد کی ریاست کے ساتھ وابستگی خود ان کے مفاد میں ہے۔ افراد کی یہ وابستگی ...... روحانی بندھنوں کے تحت ایک مشترکہ خوبصورت اور محاسن سے بھرپور زندگی کے حصول کے مقصد کے تحت ہوتی ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ افراد اپنی املاک اور اپنے کنبوں کی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔

ارسطو، ریاست کو فرد کے مماثل ایک عضویاتی کل (Organic whole) کی صورت میں دیکھتا ہے جس کے مختلف حصے یا اعضا آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے ارسطو نے تین اعضا گنوائے ہیں: قانون کا شعبہ، انتظامی امور کا شعبہ اور عدالتی نظام .... اس کے خیال میں اچھی ریاست کا انحصار اچھے نظام پر ہی نہیں، اچھے حکمرانوں پر بھی موقوف ہے۔ پیدائش کی بنیاد پر بننے والے حکمران یعنی موروثی بادشاہ، اگر نا اہل ہوں تو قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دولت کی بنیاد پر حاصل کی ہوئی حکمرانی، اس وجہ سے ناکام رہتی ہے کہ دولت کا خمار انسان کو استبداد پر ابھارتا ہے۔ جس سے حکومت انصاف واعتدال کی راہ سے ہٹ جاتی ہے۔ موروثی بادشاہ نا اہلی کی وجہ سے اور دولت مند طبقہ تکبر و لاپرواہی کی بنیاد پر دستور سے ہٹ جاتے ہیں جبکہ "حکومت بغیر کسی دستور کے استبداد ہے، وہ

(1) Politics II, Ch.6, p-90,
Henry Thomas, Great Philosophers, p-28

ایک شخص کی ہو یا چند اشخاص کی"(1) گویا ارسطو اصل اہمیت دستور حکومت کو دیتا ہے یا حکمرانوں کے کردار کو نہ کہ ان کی تعداد اور نظام حکومت و ریاست کو...... اچھے حکمران ہوں اور دستور بہترین ہو تو نظام حکومت بادشاہی ہو یا جمہوری، کامیاب ہوسکتا ہے!

ارسطو کے خیال میں ریاست قدرتی ادارہ ہے لہٰذا اس کے دستور کی اطاعت ہی قدرتی اور فطری طریقوں پر زندگی گزارنے کے مترادف ہے۔ وہ تو غلامی کے ادارے کو بھی قدرتی سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق، پیدائش کے وقت ہی قدرت کی طرف سے حکومت انسان کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ لہٰذا قدرت کے قانون کے تحت ہی کچھ لوگ حکومت کرتے ہیں اور کچھ محکوم رہنے کے لئے ہوتے ہیں!!۔ اس کے خیال میں غلاموں سے بہتر سلوک ضروری امر ہے تاہم غلامی یونانیوں کے لئے نہیں، دیگر اقوام کو غلام بنایا جانا چاہیے۔ البتہ موروثی غلامی کو وہ ناپسند کرتا ہے یعنی قدرتی غلامی چلتی رہے، انسانی مصنوعی غلامی نہ ہو۔(2)

یہ ہے ارسطو کا تصور ریاست و حکومت، جو افلاطون سے قدرے مختلف اور خاصا متوازن معلوم ہوتا ہے تاہم اس کے تصور غلامی کے سلسلہ میں یہ سوال لا جواب موجود ہے کہ یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ کون قدرتی غلام ہے اور کسے بعد میں بنالیا گیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ غلامی کو مقدر مان کر اطمینان کرلیا جائے تو انسانی آزادی اور عمل کے سارے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ فلسفہ روبوٹ اور جانور کے لئے تو کارگر ہو سکتا ہے، انسان کے بارے میں نہیں!

ارسطو شہری اسی کو مانتا ہے جو جسمانی کاوشوں، فکر معاش اور گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد ہو۔ غلامی اور شہریت کی اس تعریف سے معاشرے کے دو طبقے

---

(1) See for details: Politics, Book-II Ch.7, p-97, 100, Book-IV, p-31, Henry Thomas, Great Philosophers, p-28

(2) See for details: Ernest Barker, Greek Political Theory, p.47, 379, James Wiser, Political Philosophy, p-51

معرض وجود میں آتے ہیں جن کی باہمی مخاصمت ریاست میں ہم آہنگی، یک جہتی اور امن وامان جیسے مثبت رویوں کو کچل دیتی ہے۔

ارسطو...... نجی املاک کو افراد کا قدرتی حق تسلیم کرتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ افراد معاشرہ اپنی شخصیت کو نکھارنے اور صلاحیت کو اجاگر کرنے کی سعی میں مصروف رہنے چاہئیں۔ شخصی آزادی اور انفرادی تعمیر کی حوصلہ افزائی ریاست کا فریضہ ہے۔ ان حقوق کو سلب کرنے سے فرد کی شخصیت مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔ گویا ریاست کے اندر ان جمہوری رویوں کی آبیاری ارسطو کی فکر متوازن کا طرۂ امتیاز ہے...... مگر یہ حقوق بھی آبادی کے ایک مخصوص طبقے تک محدود ہیں، جبکہ آبادی کی اکثریت ''شہری'' کی تعریف میں نہیں آتی، لہٰذا وہ سماجی حقوق سے بھی محروم رہتی ہے!

یونان کی سیاسی فکر میں جمہوری عنصر کی آبیاری میں افلاطون اور ارسطو کے علاوہ اپیکیورزم اور رواقیت (Epicurianism & Stoicism) کا ایک خاص کردار ہے۔

اپی کیورس (۳۴۲ ق م) یونان کا راست باز فلسفی جس نے ''تزکیۂ نفس'' اور خود ضبطی کا پرچار کیا اور شہوت پرستی و تعیش پسندی سے اجتناب کے ذریعے، فرد کو حقیقی مسرّت کے حصول کی تعلیم دی۔ تاہم اس کے پیروکاروں نے ''حصول مسرّت'' کو ہی منزل قرار دے دیا........... خود ضبطی اور ترک لذات کے اصولوں کے بغیر۔

Pleasure was the only moral good and pains was clearly evil. (1)

رواقیت کی بنیاد دراصل زینو (Xenophon) سے پڑی تھی مگر یونان کے زوال کے بعد اس فکر کے پیروکار، رومی دانشوروں پولی بئیس (Polybias201-122.B.C.)، سسرو (Cicero.104-43.B.C.) اور سنیکا Senica وغیرہ نے اسے پورے نظام سیاسی پر وسیع کر دیا۔ اپی کیورن فلسفی جسمانی مسرّت اور رواقیت پسند، ذہنی مسرّت کے

(1) Henry Thomas, Great Philosophers p-47,
J. Wiser, *Ibid*, p-70

حصول کو زندگی کا مطمح نظر قرار دیتے تھے۔اپی کیورین، انفرادی خواہشات کی تکمیل کی خاطر زندگی گذارنے کو حقیقی مسرّت سمجھتے تھے جبکہ رواقیوں کے خیال کے مطابق قانون قدرت وفطرت کے مطابق زندگی گذارتے ہوئے، خواہشات کو محدود کر کے سادہ زندگی گذارنی چاہیے۔اپی کیورس کی تعلیمات کے بارے میں وائزر لکھتا ہے:

He distinguished between intellectual and bodily pleasures and argued for the superiority of the former over the latter .(1)

(اس نے ذہنی اور جسمانی مسرتوں میں امتیاز کیا اور پہلی کو دوسری (یعنی جسمانی) خوشی پر ترجیح دی۔)

رواقیت کے جن اصولوں کو قبولیت عام کا درجہ حاصل ہوا اور وہ 'جمہوریت' کے ارتقاء کی طرف اہم قدم بنے وہ یہ تھے۔ (۱) تمام انسان یکساں ہیں (۲) سب ایک قانون قدرت کے تحت ہیں (۳) سب کے حقوق یکساں ہیں۔

ذیلر (Zeller) نے رواقیوں کا یہ دعویٰ یوں نقل کیا ہے:

Even slaves can claim their rights from us and are shown to be worthy of our esteem.(2)

(حتیٰ کہ غلام بھی ہم سے اپنے حقوق مانگ سکتے ہیں اور انہیں حق ہے کہ ہمارے وقار کے برابر مقام کے قابل ہوں۔)

گویا آج کے دور میں آزادی اور برابری کے جو نعرے استعمال ہوتے ہیں وہ جمہوریت کے فکری تانے بانے میں، رواقیوں کے داخل کردہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور مساوات کے تصورات، اپنے اندر یونان وروما کی قدیم ملوکیت کے خلاف ایک ردِّ عمل ہیں اور پیغمبر خدا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا پس منظر لئے ہوئے ہیں۔

---

(1) James Wiser, Polotical Philosophy, p-70

(2) Zeller, Outlines Of History Of Greek Philosophy, p-225

ج۔ روم میں ارتقائے جمہوریت

یونان کے زوال اوران ریاستوں پر روم کے قبضہ سے جمہوری یا عوامی طرز حکومت ختم ہو گیا مگر جمہوری فکر نے سلطنت روما کے تحت بھی اپنا سفر جاری رکھا......تا ہم یہ حقیقت ہے کہ روم کے سیاسی افکار یونان کی عمرانی فکر کا ہی تسلسل ہیں اور کوئی بڑا سیاسی مکتب فکر تاریخ روم میں نمایاں نظر نہیں آتا، البتہ پولی بیئس ،سسرو اور سنیکا کے افکار قابل غور ہیں:۔

روم میں سیاسی افکار کے باوا آدم یونانی نژاد پولی بیئس (Polybius) نے اپنے مطالعہ تاریخ اور تجرباتی نچوڑ کو اپنی کتاب ''تاریخ روم'' میں پیش کیا۔اس کے خیال میں دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح روم کا پہلا طرز حکومت ملوکیت ہی تھا۔یہ قوت و جبر کی بنیاد پر قائم ہوا مگر بعد میں عوام نے اسے تسلیم کر لیا۔ملوکیت آہستہ آہستہ اپنی خوبیوں سے محروم اور استبدادیت سے بھرپور ہوتی چلی گئی۔اشرافیہ نے بادشاہ کا خاتمہ کر کے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اشرافیہ کے تحت اقتدار چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ گیا تو اس کے ردّعمل میں جمہوریت معرض وجود میں آئی۔ جمہوریت پر زوال آیا تو اس کی جگہ عوام الناس کی ''انبوہی حکومت'' قائم ہو گئی......یہی اصول اور طریق عمل ہر جگہ جاری رہتا ہے:

As this abuse of privilege continues, the people, themselves,evetually rise up and establish democracies.(1)

گویا پولی بی اُس، ارسطو کی طرح ''گردش حکومت'' کے نظریئے کا قائل تھا۔اس نے اچھی حکومتوں اور ان کے خراب حکومتوں میں تبدیل ہونے کے عمل کو ارسطو کے طریقے اور تفصیل کے مماثل طور پر بتایا ہے۔اس کے مطابق اچھی حکومتیں ملوکیت ،اشرافیہ اور جمہوریت ہیں۔یہ منفی روپ یوں اختیار کر لیتی ہیں کہ ملوکیت،

(1) James Wiser, Political Philosophy, p-65,

جبریت میں، اشرافیہ، چندلوگوں کی حاکمیت میں اور جمہوریت ،انبوہی حکمرانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

The legitimate forms were Kingship, aristocracy and democracy; their corrupted counter parts were tyranny, oligarchyand ochlocracy or mob-rule.(1)

اسی طرح قدیم طرز جمہوریت کا حامی اور گردشی طرز حکومت کا مؤید سسرو(Cicero:104-43.B.C)،اس خیال کا قائل تھا کہ ریاست،لوگوں کی رضامندی سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کے خیال میں اس طرح لوگ اپنے آپکو ایک قانون کے تحت منظّم کر لیتے ہیں۔اس قانون کی رو سے سارے انسان ایک جیسے ہیں۔ اس قانون کی مطابقت قانون قدرت کے ساتھ ہے۔جو عالمگیراور دائمی ہے۔اس کے خیال میں ریاست......سوائے قانون میں شرکت کر لینے اوراس کا پابند ہو جانے کے، کچھ نہیں......(2)

اس کے مطابق بادشاہت ریاست کے لئے موزوں ہے۔اس نے مرکب طرز حکومت آئین کی تحسین کی ہے۔ تاہم وہ حاکمیت کا مالک عوام کو سمجھتا ہے اور حکومت کو عوام کی ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ یوں اس نے حکومت اور ریاست کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔

• سینیکا(Seneca)،اگرچہ رواقی فلسفے سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے حصول مسرت کی تعلیم نہیں دی بلکہ فرد کو ریاست اور معاشرے کی خدمت کرنے کی تعلیم دی۔اس نے اچھائی اور مساوات کا درس دیا۔خدا کے باپ ہونے اور انسانوں کے بھائی بھائی ہونے پر زور دیا۔وہ انسان کو سیاسی حیوان کی بجائے ایک اخلاقی وجود قرار دیتا ہے۔اس کے خیال میں ہمدردی، خیرات، خدمت خلق، محبت اور رحم و کرم کے

(1) See for details:James Wiser, ***Ibid***, p-77

(2) See for details:Will Durant, Caesar And Christ, p-305-307

جذبوں کو اوّلین حیثیت ملنی چاہیے۔

روم کے اس معلم اخلاق کے اس طرز فکر و عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ رومی تاریخ کے بدترین بادشاہ نیرو (Nero) کے دور حکومت میں وزیر رہا تھا۔ اس نے بادشاہت کا ظلم و جبر اور سیاسی چال بازیوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کی ابتدائی سادہ زندگی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں اس سنہری دور کے لوگ خوش و خرم تھے۔ وہ معصوم تھے کیونکہ تعیّش اور تکلفات سے دور تھے۔ بے شک وہ تمدنی اعتبار سے پسماندہ تھے۔ مگر ان کی کم علمی، معصومیت، سادگی اور اچھائی، مساوات اور بھائی چارے سے معمور تھی۔ وہ نجی املاک کی حرص و ہوس میں ملوّث نہیں ہوتے تھے۔ وہ قدرتی ریاست کے شہری تھے اور اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا سربراہ چن لیتے تھے۔ (1)

گویا سینیکا کا سارا فلسفہ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' کی منہ بولتی تصویر ہے۔ وہ انسان کی مادّی ترقی سے زیادہ اہمیت اس کی ذہنی تربیت کو دیتا ہے۔ جیسا کہ ول ڈیوراں (Will Durant) نے، اس کا قول نقل کیا ہے:

The body once cured,often ails again..but the mind, once healed is healed for good and all.(2)

(جسم، ایک دفعہ کے علاج کے بعد اکثر دوبارہ بیمار ہو جاتا ہے، مگر ذہن ایک دفعہ صحت یاب ہو جائے تو ہمیشہ کے لئے صحت مند رہتا ہے۔)

اس کے خیال میں لوگوں میں جب مطلق العنانیت آجاتی ہے تو وہ ایک بادشاہ کی صورت میں ہو یا جمہوریت کی صورت میں، ظلم کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ سے بچ کر کئی لوگوں (جمہوریت) پر انحصار کرنا زیادہ خرابی کا باعث بنتا ہے۔ کسی ایک یعنی بادشاہ کے اچھا

(1) Will Durant, *Ibid*, p-305 (2)*Ibid*,p-304

ہونے سے نہیں بلکہ پورے معاشرے کے اچھا ہونے سے تبدیلی کا امکان ہے۔(1)

روم کا ''قانونی'' اور ''سیاسی'' شخص سینیکا کے فلسفے کا کیسے قائل ہو سکتا تھا؟ مگر اتنا ضرور ہوا کہ انسان کی اخلاقی حیثیت کی اہمیت اجاگر ہوئی اور اس کا احساس بھی بڑھ گیا۔ لوگ اس کے افکار کی بدولت یہ سمجھنے پر تیار ہو گئے کہ انسان کے مذہبی اور اخلاقی معاملات میں ریاست وحکومت کو دخل اندازی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ ریاست کو چاہیے کہ وہ معاشرے کی اخلاقی قدروں کو نشو ونما دینے پر توجہ دے۔ یوں ان میں تمدنی محاسن خود بخود پیدا ہوں گے اور خود آئین کی بالا دستی اور اچھی حکمرانی میسّر آسکے گی۔

روم میں پانچویں صدی قبل مسیح سے عوامیت کا دور شروع ہونے کے آثار نمایاں ہوئے جب ملوکیت آئینی اور انتخابی بادشاہت میں تبدیل ہوئی مگر حقوق شہریت کی بنیاد، زمین کی ملکیت ہی رہی اور مجلس انتظامیہ منتخب کرنے کا اختیار صرف زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ رہا۔ یہ ''شہری'' مجلس بادشاہ کا انتخاب کرتی جو تاحیات بادشاہ رہتا اور بیک وقت جج اور مذہبی پیشوا بھی ہوتا۔ ''سینٹ'' کا ادارہ بادشاہ کی صوابدید پر اعلیٰ خاندانون میں سے ''منتخب'' اعیان پر مشتمل ہوتا۔ دوسرے درجے کے شہری یعنی کاشتکار اور عوام کی کثرت میں اضافہ اور سلطنت میں توسیع کے ساتھ ساتھ عوام کی فوج میں شرکت نے سیاسی شعور اور سیاسی حقوق کے مطالبات کی نشو ونما کی اور دو تین صدیاں جمہوریت کے ارتقائی سفر میں گذریں۔ ۴۹۴ق م میں عوام کی تنظیم ''مجلس عوام'' کا آغاز ہوا جس کے عہدہ دار ایک سال کے لئے منتخب ہوتے جنہیں ''ٹریبون'' کہا جاتا۔ نصف صدی کے سفر کے بعد ۴۴۹ق م میں عوامی ٹریبون کے احترام کا قانون پاس ہوا اور مجلس عوام کے فیصلے سینٹ میں پیش ہو کر قانون کی حیثیت اختیار کرنے لگے۔ شہریوں کو اقتصادی حوالوں سے پانچ طبقات

(1) Will Durant, ***Ibid***, p-304, 305

میں تقسیم کیا گیا اور ہر طبقہ کو ذیلی حلقوں میں تقسیم کر کے ان میں سے ایک ایک رکن کو ''مجلس صدہ'' کا نمائندہ بنایا گیا۔ انتظامی تقسیم کار کے اسی نظام نے ترقی پا کر بعد میں صوبہ Province اور ضلع District کی تقسیم اختیار کی اور بلدیاتی یا میونسپلٹی نظام، وضع کیا گیا۔ عدالتی امور کے لئے مجسٹریٹس اور ذیلی مجسٹریٹس کا مقرر کیے جانے لگے۔ عوامی نمائندگی کے اس وسیع نظام میں جمہوریت کا سفر جاری رہا، تاہم سلطنت کی وسعت کے ساتھ مقبوضہ علاقوں اور ''کالونیز'' کے شہریوں کو سیاسی وسماجی حقوق ایک محدود پیمانے پر میسر آئے۔ رومی سلطنت ایک کنفیڈرشن بنی جس میں اگرچہ صوبائی خود مختاری وسیع پیمانے پر موجود تھی ...... مگر شہری حقوق صرف اس صوبے کو حاصل ہوتے جہاں رومی شہری یا نو آبادکار اپنے شہر بسا لیتے۔ عوام الناس غرباء و مجبور یا مفتوحہ قوموں کو غلام بنانے کی رسم ''پوری آب وتاب'' کے ساتھ موجود رہی اور تیسری صدی عیسوی کے وسط میں جب دوبارہ شہنشاہیت قائم ہوئی تو اس دور میں غلاموں کی منڈیاں۔ ان کی خرید وفروخت' وسیع پیمانے پر ان کا بے دریغ قتل اور وحشی درندوں کے ساتھ ان کی خونی لڑائیاں جاری ہوگئیں۔ (1)

اہل روم کا قابل قدر اور قابل فخر کارنامہ ''رومی قانون'' ...... انسانیت کے لئے تحفہ ہے۔ اس قانون کے بنیادی مآخذ شہریوں کی رضا اور منشا تھے۔ گویا اس کی بنیاد جمہوری تھی ۔ دوسرے درجے میں قدیم قبائلی اسمبلیوں، روایات اور عدالتی کارکنان کے فیصلے آتے تھے:

The first Person in Roman Law was the citizen(2)

رومی قانون میں شہری کے حقوق وفرائض، جائیداد اور دولت کے معاملات کے لئے قواعد وضوابط، عدالتی کاروائی اور تعزیرات جرائم کی تفصیل کا بیان موجود تھا۔ اس دستور کا ایک حصہ علیحدہ سے مفتوح اور ملحقہ ریاستوں کیلئے مخصوص تھا۔ اس قانونی

(1) See for details: Will Durant, ***Ibid***, p-394, (2) ***Ibid***

دستاویز میں بنیادی حیثیت لوکل اور علاقائی ضوابط کو حاصل تھی مگر اس میں سلطنت روم کے اقتدار اعلیٰ کا بطور خاص اضافہ ہوتا۔

رومی قانون کا تاریک پہلو غلاموں کے حقوق کا انکار اور مفتوحہ علاقوں کے فرائض وحقوق کا غیر متوازن خاکہ تھا۔ بلکہ ول ڈیوراں کے بقول۔

The legal subjection of slaves is the worst blot on Roman Law.(1)

تاہم ان کمزوریوں کے باوجود انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ایسے منضبط قواعد کی دستاویز کی صورت میں رومن لاء ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

As Greece stands in history for freedom, so Rome stands for order; and as Greece bequeathed democracy and philosophy as the foundations of individual liberty, so Rome has let us its laws and its tradition of administration, as the bases of social order. (2)

(جس طرح تاریخ میں یونانیوں کا مقام انسانی آزادی کے حوالے سے ہے، اسی طرح رومیوں کا طرۂ امتیاز نظم وضبط ہے۔ یونانیوں نے جمہوریت اور فلسفہ کو انفرادی آزادی کی بنیاد بنایا اور روم نے ہمیں قانون کے ساتھ انتظام و انصرام کی روایت عطاء کی، جو سماجی نظم کی بنیاد ہے۔)

(1) Will Durant, ***Ibid***, p-398 (2) ***Ibid***, p-391

حاصل مطالعہ

☆ قدیم انسانی سماج کی ہیئت حاکمہ قبیلے کے سردار پر مشتمل ہوتی تھی جسے افرادِ قبیلہ کی تائید حاصل ہوتی۔ سربراہ قبیلہ اپنی شہری ریاست کے معاملات مشاورت سے چلاتا تھا، یہی جمہوریت کی ابتدائی صورت تھی۔

☆ دنیا کے متمدن حصوں میں ایسی سینکڑوں ریاستوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔ جدید جمہوریت کا ابتدائی خاکہ یونان کی شہری ریاستوں کے نظام میں نظر آتا ہے، جہاں تمام شہری، حکومتی معاملات میں براہ راست شریک ہوتے تھے۔

☆ مذکورہ ریاستوں کے معاشرے طبقاتی تقسیم کا شکار تھے۔ غلام اور عورتیں (یعنی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی) ''شہری'' کی تعریف میں نہیں آتے تھے۔ لہٰذا وہ بنیادی شہری حقوق سے محروم رہتے۔

☆ شہری ریاستوں کے معاملات مخصوص اشرافیہ کے ہاتھوں میں تھے، تاہم شہریوں کی نمائندگی اور مشاورت کو وسیع کرنے کے لئے جمہوری ادارے (مجلس شوریٰ، مجلس پنج صد وغیرہ) ترتیب دیئے گئے تھے۔ قرعہ اندازی یا انتخاب کا ایک باقاعدہ عمل موجود تھا جس کے ذریعے عوامی نوعیت اور اہمیت کے اداروں سربراہ مقرر کیئے جاتے۔

☆ فکرودانش کا فروغ وارتقاء ان ریاستوں کا طرہ امتیاز ہے جو تاریخ انسانی میں بے مثل ہونے کے ساتھ ساتھ یونان کی سیاسی بصیرت کو چار چاند لگانے کا باعث بنا۔ ایک طرف فیثا غورث اور سقراط جیسے ''مذہبی'' فلسفی جو انسانی مساوات اور عورتوں کے حقوق کے پاسبان تھے اور دوسری طرف افلاطون اور ارسطو جیسے'' سیکولر'' اہل دانش جو دستور وآئین اور ریاست وحاکمیت کے اصول وضع کرتے۔

☆ یونان کے زوال کے بعد رومی سلطنت کی صورت میں زمین کا یہ خطہ جمہوریت کی

آبیاری میں سرگرم عمل رہا۔ اس سیاسی لیبارٹری میں بادشاہت سے اشرافیہ اور اشرافیہ سے جمہوریت کا گردشی سفر آہستہ آہستہ جاری رہا۔

☆ سلطنت روم نے جمہوریت کی ترقی میں بنیادی کردار ایک طرف تو دستور و آئین کے ارتقاء کی صورت میں ادا کیا...... جس کے ذریعے شہریوں کے بنیادی حقوق کا تعین اور تحفظ ہوا...... دوسری طرف ریاست و تمدن کے انتظامی سدھار کی شکل میں، جس سے قانون، مملکت کا حسن انتظام اور خوشگوار شہری زندگی ترویج پا گئی۔

☆ امور سلطنت میں عوامی شمولیت کا یہ ابتدائی سفر شاہی دراندازیوں سے بار بار متاثر ہوتا رہا...... بہر حال سیاسی دنیا اس تجربے کی بدولت ان بنیادی اقدار سے شناسا ہوئی جو بعد میں ایک نئے نظام حکومت میں ڈھل گئیں۔ یوں جمہوری فکر اور جمہوری اداروں کی نشو ونما خواب سے حقیقت بنی۔

باب سوم

یورپ کا دورِ ظلمت اور جمہوریت

دورِ ظلمت

پانچویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک کی دس صدیاں یورپ میں جمہوریت کا دورظلمت (Dark Ages) ہے۔ کبھی بادشاہت اور پاپائیت کی کشمکش اور کبھی ان دونوں کا عوام الناس کیخلاف ''خوشگوار'' سمجھوتہ! اس دور میں جمہوریت کے ارتقاء کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ سوائے مطلق العنانیت اور عوامیت کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کے، جو ہمیشہ سے تاریخ انسانی کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

یورپ کی جدید اور قدیم تاریخ کا تقابلی مطالعہ یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ آج کے یورپی ممالک کی سیاسی وسماجی آبیاری، پانچویں صدی قبل مسیح کی یونانی تہذیب اور پانچویں صدی بعد از مسیح کے کلیسائی روم نے کی ہے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ دوسری صدی کی سلطنت روما شمالی افریقہ، مغربی ایشیا، سپین، فرانس، جنوبی برطانیہ اور میڈیٹرینین ممالک پر مشتمل تھی۔ سکاٹ لینڈ، جرمنی، سکنڈے نیویا، آسٹریا اور رشیا اس کے گنجان آباد علاقے تھے:۔

From the Atlantic seaboard of Spain and Gaul to the Black Sea,from the Jyne, the Rhine, and the Denube in the North to the Sahra in the South, the provincial organization of the Roman Empire stood intact and hundreds of cities reproduced in miniature the life of the city itself, Rome.(1)

(1) Denys Hay, From Roman Empire To Renaissance Europe, p-2

فلسفے کے زیر اثر تیسری صدی عیسوی میں رومی قانون کا ارتقاء ہوا۔ یہ دستور روم کے زیر اثر ممالک کے رواجوں اور جرمانی عوام کے تحریری ضابطوں کا حسین امتزاج تھا۔ چوتھی صدی میں یورپ ایک سیاسی وحدت کی شکل اختیار کر چکا تھا جبکہ عیسائیت کے عروج نے اس کی یکجہتی کو مزید مضبوط کیا۔ تاہم پانچویں صدی میں کلیسا کے سیاسی اختیارات میں مسلسل اضافہ نے ریاست کے اندر ریاست کی سی صورتحال پیدا کر دی اور بقول ارنسٹ برکر (Ernest Barker):

Today in England Church and State are two societies, but they have one government, which is the king in parliament.

It was the opposite in the Middle Ages Church and State were society; but the society had two governments. (1)

دراصل عہد وسطیٰ کے آغاز ہی میں رومی سلطنت کے سیاسی ڈھانچے میں کچھ مذہبی عقائد کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے جو شہنشاہ تھیوڈیسئس (Theo-Dasius) کے دور میں عیسائیت کو سرکاری مذہب بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ عیسائیت روم میں اس رواقی (Stoic) عقیدے کے تحت پھلی پھولی تھی کہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اس عقیدے کے تحت انسان کی انتہائی قدر و قیمت کو ''اشرف المخلوقات'' کی بنیاد پر پوری طرح تسلیم کیا گیا تھا۔ گویا یہ جمہوریت کے ارتقاء کی جانب ایک قدم تھا۔ جلد ہی عیسائیت کو سرکاری سرپرستی کے بدولت نظم وضبط کا تحفہ ملا تو پاپائے روم تاجدار سیاست بن گیا۔ کلیسائی افکار کے مطابق حکمرانی کا اختیار خدا کی طرف سے عطا کردہ تھا (2) جبکہ روم کا نظریہ ریاست عوام کو قوت کا سر چشمہ قرار دیتا تھا۔ تاہم سرکاری مذہب کی حیثیت سے عیسائیت نے قدم بڑھائے تو

---

(1) Ernest Barker, Greek Political Theory, p-70

(2) Hernshaw, The Social And Political Ideas Of Some Great Mediaval Thinkers, p-14, صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی: 135

پوپ کی سیاسی حیثیت اور بادشاہ کی مذہبی حیثیت ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں۔ چھٹی ساتویں صدی عیسوی تک یورپ سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کمزور ہو چکا تھا مگر مذہبی اجارہ داروں کی گرفت سیاسی اداروں پر، مستحکم ہو چکی تھی۔

اسی دور میں سرزمین عرب میں رسول خدا ﷺ کی زیر قیادت اسلامی ریاست قائم ہوگئی جو سیاسی و جغرافیائی وسعتوں سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ اہل عرب کے ساتھ رومیوں کی رقابت کا سلسلہ حرم مکہ پر ابرہہ کے حملے (۵۶۹ء) سے تیز تر ہو چکا تھا۔ ۶۳۰ء میں شام کے شہر بصریٰ کے گورنر شرجیل نے جب سفیر رسول ﷺ کو شہید کر دیا تو مسلمانوں کے ساتھ رومیوں کی جنگوں کا آغاز ہوا۔

نویں صدی کا آغاز شارلی مان (Charlemagne) کی پوپ کے ہاتھوں، مذہبی رسومات کے ساتھ، تاج پوشی سے ہوا جب کہ روم کی ریاست کو ''مقدس سلطنت روما'' (Holy Roman Empire) کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ یہ پوری فیڈریشن آج کل کے فرانس، جرمنی، اٹلی اور وسطِ یورپ کی ریاستوں (کے علاقے) پر مشتمل تھی۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کی دنیا میں، بنو امیہ کے عہد کے بعد دولت عباسیہ قائم ہو چکی تھی اور سپین میں بنو امیہ اسلامی ریاست کا آغاز کر چکے تھے۔ رسول خدا ﷺ کی قائم کردہ ریاست اسلامی کی اس دور میں روز افزوں وسعت اور روم کا زوال ڈینس ہے (Denys Hay) نے یوں بیان کیا ہے:۔

Within a century of Muhammaed's death the eastern Empire was battling for its life at the very gates of Constantinople, North Africa had been over-run and so had Spain, while the Persian Empire had been destroyed and Islam was already turning East.(1)

(محمد ﷺ کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر ہی مشرقی سلطنت (روما)

(1) From Roman Empire to Renaissance Europe, p-34

قسطنطنیہ کے دروازوں پر، اپنی بقاء کی جنگ (مسلمان فوجوں کے خلاف) لڑ رہی تھی، شمالی افریقہ مفتوح ہو چکا تھا اور اسی طرح سپین بھی۔ اسی دوران سلطنت فارس زیر ہوئی اور اسلام مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔)

شارلمان کے بعد سلطنت روما انتشار کا شکار ہوئی مگر پوپ کا اختیار اور اجارہ داری برقرار رہی، منقسم ریاست کے ہر حصے میں ہر بادشاہ کا تقرر پوپ کی مرضی سے ہوتا رہا۔ عوام کی مرضی یا حقوق کا کوئی تصور باقی نہ رہا۔ سلطنت تین حصوں اٹلی، فرانس اور جرمنی میں تقسیم ہو گئی اور سکنڈے نیویا کے جنگجو قبائل نے بدامنی پھیلانا شروع کر دی۔ تاہم یہ روایت بن گئی کہ ہر ریاست کا بادشاہ پوپ کے ہاتھوں تاج پوشی کے بعد ہی حقیقی فرمانروا شمار ہو سکتا تھا۔ کیونکہ پوپ دین و دنیا کا مالک تھا۔ معاشرے میں خواندگی کی شرح ناگفتہ بہ تھی اگرچہ گذشتہ صدی میں شارلیمان کی کوششوں سے تعلیمی ترقی کا کچھ سامان ہوا تھا مگر وہ صرف لاطینی زبان کی ترقی کے علاوہ کوئی نتیجہ نہ دے سکی۔ اور یہ بالواسطہ طور پر چرچ کی اجارہ داری میں اضافہ ہی کا ایک پہلو تھا کیونکہ:

The clergy alone knew to read and write as long as Latin was the sole medium of communication(1)

(صرف مذہبی طبقہ ہی پڑھنا لکھنا جانتا تھا کیونکہ لاطینی زبان ہی ذریعہ ابلاغ تھی (اور صرف وہی اسے جانتے اور سمجھتے تھے)۔

دوسری طرف ایک نئے سماجی بحران، فیوڈلزم (Feudalism) نے جنم لیا جو بعد کی صدیوں میں ایک دیو ہیکل جن (Giant) کی صورت اختیار کر گیا۔ جاگیرداری کے نظام نے معاشرے کو غلامی اور طبقاتی تقسیم سے دوچار کر دیا۔ ایک طرف پرتعیش زندگی گذارنے والے لارڈ اور دوسری طرف ذہنی و جسمانی مشقت میں مبتلا "سرف" (Serfs) یا زرعی مزدور...... اس نئی سماجی تبدیلی کا بھیانک پہلو یہ تھا کہ

(1) Encyclopaedia Britanica Vol.I, p-849

جاگیرداری نے مذہبی اجارہ داری کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ جاگیردار طبقے نے عوام الناس کے بنیادی حقوق پر قبضہ کر رکھا تھا جبکہ کلیسائی افکار انہیں اس کا اخلاقی جواز فراہم کر رہے تھے۔(1)

ابتدائی عہدِ وسطیٰ کا سیاسی نظریہ

مذہب عیسائیت روحانی سلامتی کے کچھ غیر سیاسی اصول وعقائد پر مشتمل تھا مگر پانچویں صدی عیسوی میں جب اسے روم پر بالادستی حاصل ہوگئی تو اس نے سیاسی فلسفہ میں دخل اندازی شروع کی۔ جب تک مذہبی پروہت اختیارات سے محروم رہے یہی تعلیم دیتے رہے کہ قیصر کی اطاعت اس حد تک کرو، جہاں تک اس کی حکومت ہے اور خدا کی اطاعت اس حد تک کرو جہاں تک خدا کی حکومت ہے .... گویا مادی سلطنت اور روحانی سلطنت (قیصر کی بادشاہی اور خدا کی پادشاہی) کی تمیز و امتیاز کا سلسلہ قائم رہا...... مگر جب پادریوں کو حکومت پر گرفت حاصل ہوگئی تو رومی سلطنت، مقدس سلطنت رومہ The Holy Roman Empire میں تبدیل ہوگئی جس کی اطاعت مذہبی فریضہ کے طور پر، لازمی قرار دے دی گئی۔(2)

عیسائیت نے قانون فطرت، مساوات انسانی اور طرز حکومت کے معاملات میں باقاعدہ اصول وضع کر لئے۔ حکومت کو خدا کی طرف سے عطا کردہ اختیارات پر مبنی جان کر ریاست کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا گیا۔ یہ نقطہ، نظر روم کے روایتی تصور حاکمیت سے جدا تھا کیونکہ وہاں عوام کو اقتدار کا مالک گردانا جاتا تھا۔ بعد میں یہی تصور حاکمیت، عیسائی پادریوں اور بادشاہوں کے باہمی نزاع کا باعث بنا رہا۔ تاہم قوانین قدرت اور ریاست کے بنائے ہوئے قوانین میں تخصیص کر دی گئی اور قانون قدرت (Natural Rights) کو ناقابل ترمیم و تنسیخ مانا گیا۔

---

(1) ، (2) شاہد حسین رزاقی، تاریخِ جمہوریت:198

ریاست کے بارے میں عیسائیت کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کا مقصد انصاف کا قیام ہے۔ چونکہ یہ ایک مقدس تصور ہے لہٰذا ریاست بھی مقدس ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے۔ املاک کے بارے میں مساوی تقسیم کا نظریہ اپنایا گیا مگر اس کے لئے جبر کی بجائے اخوت، خیرات اور غرباء کی مدد کے جذبوں کی تبلیغ کی گئی۔

اس پہلو سے عیسائیت کا عروج یورپ کی تہذیبی ترقی کا باعث بنا، جیسا کہ ول ڈیوراں (Will Durant) کہتا ہے:

To the Church, more than to any other institution, owed the resurrection of civilization.(1)

(تہذیب کا احیاء، کسی بھی دوسرے ادارے سے زیادہ، چرچ ہی کی مرہون منت تھا۔)

البتہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کے بارے میں عیسائیوں نے گول مول پالیسی اختیار کیے رکھی۔ تاہم انسانی مساوات اور تمام انسانوں کو یکساں مواقع فراہم کرنے کا تصور ضرور پھیلایا گیا۔ گویا بدلتے تقاضوں کے مطابق عیسائیت اپنے عقائد کو بنیاد بنا کر سیاسی اور سماجی اصولوں کا نقشہ تبدیل کرتی رہی۔ اس کا ایک واضح ثبوت پہلی صدی سے ساتویں صدی تک کے کلیسائی راہنماؤں کی کئی ایک معاملات میں مختلف رائے ہے۔

غلامی کے حوالے سے پاپائیت سسر و اور سینٹ پال کے تصور قانون قدرت کی تائید کرتی رہی وہ یہ کہ آقا کو رعیت کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ تاہم غلامی گناہوں کی سزا اور غلطیوں کا کفارہ ہی ہے۔

''گو کلیسا کے بڑے بڑے پیشواؤں مثلاً سینٹ امبروز، سینٹ اساڈور اور گریگوری اعظم نے غلامی کی مذمت کی مگر وہ اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے کچھ کر سکے نہ ہی اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی تجاویز پیش کیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے غلامی کو ایک ناقابل تدارک برائی قرار دیا''(2)

(1) The Story Of Civilization, The Reformation(I)p-5, 6

(2) صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی:143

سینٹ آگسٹائین (St.Augustine) نے اپنی کتاب 'De Civitate Dei' میں جس الوہی ریاست کا نقشہ پیش کیا تھا اس کے دو نمایاں پہلو انصاف اور امن تھے۔ تاہم وہ بھی غلامی کو گناہوں کی سزا قرار دے کر اس کے خاتمے کے لئے کوشش کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے کلیسا کے اختیارات کو بادشاہ کے اختیارات سے بالاتر قرار دیا اور یوں ریاست Imperium کو کلیسا Sacredotium کے زیر اثر کر دیا۔ اسی نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے بعد میں گلاسیئس (Gelasiust) نے دو شمشیری نظریہ (Two Swords Dogma) پیش کیا جس کے مطابق قیصر اور خدا کے جداگانہ تصور اطاعت کا تصور عام ہوا۔ (بعد کے برسوں میں نظریہ متوازیت نے اسی بنیاد پر فروغ پایا)(1) آگسٹائین کا خیال تھا کہ دنیاوی بادشاہوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کی جگہ خدائی سلطنت معرض وجود میں آئے گی اور شہر الوہی قائم ہوگا جو عالمگیر حیثیت اختیار کر لے گا۔

The City which shall have no end is that Civitas Dei which has its latest most perfect terrestrial manifestation in the Christian Church.(2)

آگسٹائین نے اس نقطہ نظر کے خلاف کہ......زوال روم میں بنیادی کردار عیسائیت کا ہے......اپنی کتاب میں نہ صرف عیسائیت کا دفاع کیا بلکہ روم کے عروج کو عیسائیت کے فروغ کے ساتھ مشروط قرار دیا۔ اس کے خیال میں روم کا زوال بداعمالیوں کا نتیجہ تھا۔ قدیم وجدید مؤرخین نے بہر حال عیسائیت کے سیاسی تسلط کو سلطنت روم کی تباہی اور اس کے دور ظلمت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔

تاہم ول ڈیوراں (Will Durant) نے اس کی تردید کی ہے۔ اس کے خیال میں زوال روم کی وجہ عوام اور ان کی اخلاقی حالت کے علاوہ معاشرے کا طبقاتی نظام،

(1) James Wiser, Political Philosophy, p-100, 109

(2) Hernshaw, The Social And Political Ideas, p-14

نوکرشاہی کی اقربا ءپروری، روبہ تنزل تجارت، محصولات کا سخت نظام اور تباہ کن جنگیں ،بنیں۔اس کے بقول:

A great civilization is not conquered from without until it has destroyed itself within.(1)

(ایک عظیم تہذیب اس وقت تک باہر سے فتح نہیں کی جاسکتی جب تک وہ خود اندر سے اپنے آپ کو برباد نہ کرلے۔)

آخری ازمنۂ وسطیٰ اور کلیسائی افکار

نویں صدی عیسوی کے بعد عیسائیت نے دین کے سارے معاملات پر اپنی گرفت مظبوط کرلی۔پوپ گریگوری اعظم کی اصلاحات نے کلیسا کو ایک نا قابل تسخیر ادارہ میں تبدیل کردیا۔گیارھوں صدی میں کلیسا اور ریاست کے درمیان اختلافات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔جو قریباً دوصدیوں تک جاری رہا مگر فتح بالآخر پاپائیت کی ہوئی۔ اس اختلاف رائے نے مفکرین کے دو طبقے پیدا کیے۔جن میں سے ایک کلیسا کا طرف دار تھا اور دوسرا ریاست کا!ذیل میں ان کے افکار کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ہلڈر برانڈ (Hilderbrand) یعنی گریگوری ہفتم، ریاست پر کلیسا کی حاکمیت کا موید تھا۔پوپ ہونے کی وجہ سے عیسائیت کو اس نے جدید سیاسی اصلاحات سے مزین کیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ روحانی و دنیاوی تمام امور پر مکمل گرفت رکھنے کے مرتبے پر فائز ہوسکے۔وہ اچھے معاشرے کے قیام اور انصاف کی ترویج کا ذریعہ، محض کلیسا کی زیر سرپرستی قائم رہنے والی ،حکومت کو قرار دیتا تھا۔

گریگوری ہفتم سے پہلے کلیسائی انتظامیہ بادشاہ کی طرف سے نامزد ہوتی تھی جبکہ اس نے ایسی تقرریوں کو کالعدم قرار دے دیا۔یوں بادشاہ ہنری ہفتم کے ساتھ اس کی

(1) Will Durant, Caesar And Christ, p-665

معرکہ آرائی میں اضافہ ہو گیا مگر بالآخر بادشاہ کو پاپائیت کے سامنے جھکنا پڑا (1)

سینٹ برنارڈ St,Bernard کی تصنیف De.Consideratione اس کے سیاسی افکار پر مشتمل ہے۔ برنارڈ دنیا داری سے متنفر، ایک بےلوث پرہیز گار آدمی تھا۔ وہ کلیسا کو حکومت سے برتر ان معنوں میں سمجھتا تھا کہ حکومت دنیا داری اور جسمانی امور سے تعلق رکھتی ہے جبکہ کلیسا کا کام روحانی معاملات کی درستگی ہے۔ اسے دیناوی امور سے الجھ کر اپنے وقار کو خراب نہیں کرنا چاہیے (2)

مین گولڈ Manegold نے بھی گریگوری ہفتم کے زیر اثر کلیسا کے اختیارات کی تائید کی......تاہم وہ حکومت کو ایسا خدائی عطیہ سمجھتا تھا جو عوام کی طرف سے، ایک معاہدہ کے تحت، حکمران کو تفویض کی جاتی ہے۔ اس کے خیال میں انصاف کرنا حکمران پر لازم تھا۔ اس اصول کی خلاف ورزی کی صورت میں اسے اپنے عہدے سے معزول کیا جاسکتا ہے......اس کے خیال میں ایک غیر منصف، جابر اور غیر ذمہ دار بادشاہ عوام سے اطاعت کا تقاضا نہیں کرسکتا۔ (3)

جان آف سالسبری (1115-1180) نے اپنی تصانیف Policraticus اور Metalogicus میں کلیسا کے اختیارات کی حمایت کے ساتھ، اس کی بدعنوانیوں پر سختی سے تنقید بھی کی۔ اس نے ریاستی ڈھانچہ کو انسانی جسم کے مشابہ قرار دیا (یہ نقطہ نظر دسویں صدی عیسوی کے مسلمان سیاسی مفکر ابونصر فارابی کا تھا) بہر حال اس نے آگسٹائین کی طرح ریاست کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ کلیسا کے زیر سرپرستی کا کام کرے۔

Both St.Augustine and John of Salisbury make the State serve the Church but they reach their conclusion in different ways.(4)

---

(1) See for details: J. Wiser, Political Philosophy, p-111-115
(2) See for details: Alington, Europe, p-107, (3) *Ibid*,
(4) Hearnshaw, The Social And Political Ideas, p-55

سینٹ تھامس اکیوناس(Thomas Acquinas)

ارسطو کی سیاسی فکر کو، نیا جنم دینے والا یہ مفکر، اس بات سے متفق تھا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اوراس کی نشو ونما ریاست کے وجود کے بغیر، ناممکن ہے۔ وہ معاشرے اور ریاست کو ایک قدرتی سکیم سمجھتا تھا۔ وہ ایک متعصب عیسائی مفکر تھا ،جس نے صرف عیسائیوں کو حقوق شہریت دینے پر زور دیا۔ وہ بڑی ریاستوں کی بجائے شہری ریاستوں کے قیام کے حق میں تھا جس سے گویا، بنیادی جمہوریت کی طرف، اس کے رجحان کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ شاہی طرز حکومت کو ترجیح دیتا ہے تاہم اسے تعلیم عام کرنے اور افلاس کے خاتمہ کی ذمہ داری سونپتا ہے اکیوناس نے حکومت کی قسموں کے بارے میں پہلے سے مختلف اور منفرد خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں حکومتوں کی تقسیم اس طرح سے ہے:۔

ا۔متبرک اور شاہی.Sacredotal and Royal ۲۔شاہی.Royal

۳۔سیاسی.Political ۴۔اقتصادی.Economic

اس کے خیال میں سب سے بہتر طرز حکومت مذہب سے وابستہ بادشاہی کا نظام ہے۔ جو عوام میں بہتری اور محاسن کردار پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہے۔ اس نے بادشاہت کو جبر سے دور رکھنے کے لیے سخت قوانین پر زور دیا ہے۔ ارسطو کی طرح وہ بھی جمہوریت کو بدترین طرز حکومت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے چند سری حکومت یا اشرافیہ کی بھی مخالفت کی ہے۔(1)

اکیوناس ریاست پر کلیسا کی برتری کا قائل ہے کیونکہ اس کے خیال میں سلامتی، ایقان کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جو مذہب کے ساتھ وابستہ ہے، ریاست کے ساتھ نہیں! دنیا کے حکمران کو صرف امور دنیا کی انجام دہی، سلطنت کے ذریعے کرنی چاہیے اور پوپ کو روحانی پہلو سے حاکم تسلیم کیا جائے۔ پوپ کی اطاعت ہر

(1) See for details: James Wiser, Political Philosophy, p-120

شہری کے لیے ضروری ہے، خواہ وہ بادشاہ ہو۔ اس سے انحراف کی صورت میں پوپ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اسے مذہب سے خارج کر دے۔

اس سلسلہ میں وائزر (Wiser) کا تبصرہ موزوں ہے:۔

Kings were to order those things which were within their domains but they ,in turn, were to be ordered by those who were charged with caring for human spiritual perfection.(1)

(بادشاہوں کو اپنی حدود میں رہ کر اختیارات کا استعمال کرنا ہے جب کہ وہ خود ان لوگوں کے حکم کے ماتحت ہوں گے جن کے ذمے انسانوں کی روحانی تکمیل کا کام سپرد کیا گیا ہے۔)

اکیوناس نے قانون کو قدرتی اور غیر متغیر قرار دیا ہے۔ اس نے خدا کی ذات ،قدرت اور انسان کو اس زنجیر کی کڑیاں گردانا ہے جو فطرت سے مکمل تطابق رکھتی ہوں ۔قانون اور انصاف باہم مربوط ہیں اور انصاف کی بنیاد قانون پر ہوتی ہے۔ ریاست انسانی جسم کی مانند ہے اور قانون اس کے حواس خمسہ کی جگہ پر ہے۔(1) اکیوناس نے قانون کی چار قسمیں بیان کیں:

ا۔ابدی.Eternal، ۲۔قدرتی یا فطری.Natural، ۳۔الٰہی Divine، ۴۔انسانی.Human

ابدی قانون سے مراد خدا کا قانون ہے۔ جس کے مطابق وہ کائنات کے نظام کو جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ فطری قانون ہر انسان کے قلب پر نقش ہے اور اسے معاشرتی وسماجی زندگی ترتیب دینے اور امتیاز خیر وشر سے بہرہ ور کرنے کا کام کرتا ہے۔

قانون الٰہی خدا کا وہ ارادہ ہے (جسے ہم ہدایت ربانی کہہ سکتے ہیں) جو لوگوں تک انجیل یا مذہبی راہنماؤں کے وسیلہ سے پہنچتا ہے۔ یہ انسانی دریافت نہیں

(1) See for details: James Wiser, *Ibid*, p-122

بلکہ خدا کا عطیہ ہے۔ انسانی قانون کا مآخذ فطری قانون ہے۔ لٰہذا وہ فطری قانون سے ادنیٰ ہے۔ اس کی بنیاد انسانی منشا پر ہوتی ہے۔ تاہم یہ اس وقت تک کارآمد ہوتا ہے، جب تک فطری قانون سے ہم آہنگ ہو(1)

''سینٹ اکیوناس ان مفکروں میں سے ایک تھا جو حکمت الوہی اور علوم انسانی میں ربط قائم کر کے، بنی نوع انسان کی بھلائی اور بہبود کو اپنا مقصد سمجھتے تھے۔ اسی لیے اس کی تحریروں میں اگر ایک طرف ارسطو اور سسرو کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف اسمیں اکیوناس نے عیسائیت کی چاشنی پیدا کردی ہے''(2) جس میں بعد میں آگسٹس ٹرائمفس (Augustus Triumphus) نے اضافہ کیا کہ پوپ کو دنیا کا مختار کل اور حرف آخر قرار دے دیا۔ اس کے مطابق پوپ زمین پر خدا کا نائب تھا اور براہ راست خدا سے اختیارات حاصل کرتا تھا۔ اس کے اختیارات لامحدود تھے اور وہ تمام امور دین و دنیا کا مطلق راہنما تھا۔ دنیاوی بادشاہ اس کے چاکر تھے اور پوپ کے اختیارات میں کسی کو دخل نہیں تھا۔

حکومت و ریاست کا یہ تصور، اسلامی تعلیمات کے اس نظریہ سے جزوی مماثلت رکھتا ہے جو انبیاء کی خلافت کے ساتھ وابستہ ہے۔ تاہم اس تصور حاکمیت میں غلو پایا جاتا ہے۔ انسان کو مختار کل اور لامحدود اختیارات کا مالک قرار دینے سے معاشرے کی سماجی زندگی پر منفی اثر پڑتا ہے اور زمین پر انسان کے نائب الٰہی ہونے کے تصور میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے جو کہ ہدایت الٰہی (یا اسلامی تعلیمات) کے منافی ہے!

ابھی تک ہم نے کلیسا کے حامی مفکرین کا ذکر کیا ہے، اب دوسرا پہلو دیکھتے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں کلیسا کے خلاف ردعمل تیز تر ہو چکا تھا۔

---

(1) صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی: 143 (2) ایضاً

Throughout the fourteenth century the Church sufferred political humiliation and moral decay.(1)

(پوری چودھویں صدی، چرچ، سیاسی تذلیل اور اخلاقی زوال جھیلتا رہا۔)

خاص طور پر فرانس نے کلیسائی روم پر قبضے کی ٹھان لی۔ سلطنت اور پوپ کا بُعد اور ٹکراؤ بھی رنگ لانے لگا۔ عوام کی طرف سے پوپ کی بجائے بادشاہ کی حمایت کو ترجیح دی جانے لگی اور اس طرح یورپ میں قومی ریاستوں کے قیام کا رجحان چل نکلا۔ ایسے میں کچھ مفکرین، کلیسا کی جگہ ریاست کے مؤقف کی حمایت میں نمودار ہوئے، ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے:۔

مارسیلیس (Marsilius) جو شروع میں پاپائیت کا نہ صرف مؤید بلکہ خود آرک بشپ تھا، بعد میں باغی ہوگیا۔ اس کی دو تصانیف Defensor Pacis اور Densor Minor ہیں، جن میں اس نے اپنے سیاسی افکار کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس نے ریاست کو پاپائیت سے آزاد کروانے اور پادریوں کی مراعات کم کرنے پر زور دیا۔ وہ عوامی حاکمیت یا جمہوری حکومت کے حق میں بھرپور دلائل دیتا ہے۔ اس نے عوامی اسمبلی Legislator Humanus کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس کے خیال میں عوامی خواہش اور منشا، قانون سازی میں اہم بنیاد ہونی چاہیے۔ تاہم وہ معاشرے میں قابل احترام اور قابل قدر عناصر کی اکثریت کو ہی فیصلہ سازی کا اختیار دیتا ہے۔ وہ انتخابی بادشاہت کو بطور طرز حکومت ترجیح دیتا ہے۔ اور بادشاہ اس کے خیال میں ملکی معاملات کا منتظم اور ناظم ہے جبکہ قانون سازی صرف عوامی اسمبلی کرسکتی ہے۔

مارسیلیو، جو کہ کلیسا کے مذہبی نظام کا بھی حصہ رہ چکا تھا، پاپائیت میں اصلاحات کا علمبردار بنا، اس نے کلیسا کے معاملات میں جمہوریت لانے کی بات کی۔ پوپ کی مختار کل والی حیثیت ختم کرنے اور کلیسا کی اصلاح کے لیے اس نے ایک مذہبی

(1) Will Durant, The Story Of Civilization The Reformation (I), p-6

اسمبلی کی تجویز دی جسے پوپ پر برتری حاصل ہو اور اس کی اکثریتی رائے سے تمام فیصلے کیے جائیں۔(1)

اس نے کلیسا کو ریاست کا ماتحت ادارہ قرار دیا اور اسے صرف روحانی معاملات سنبھالنے کو کہا۔ اس نے پادریوں کے سیاسی اختیارات ختم کرنے پر زور دیا کہ اس طرح پوپ اور اس کا ماتحت عملہ دنیاداری میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اپنی حد سے تجاوز کے نتیجے میں بددیانت بھی ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں پوپ کو قناعت اور پاکیزگی کا نمونہ ہونا چاہیے۔ کلیسا کے لیے املاک کا وقف بھی، اس اصول کے خلاف ہے۔

یہ جمہوری مفکر عوام کی تعلیم اور شہریوں کی مساوات کا دلدادہ تھا۔ اس کے خیال میں اس مقصد کا حصول معاشرے میں معاشی ناہمواری کے خاتمے کے ذریعے ممکن ہے۔ مارسیلیو اپنے کولیگ، ولیم آف اوکہم (۱۲۹۰۔۱۳۴۷ء) کا زبردست حامی تھا۔ ولیم غالباً یورپ کا وہ پہلا مفکر تھا جس نے عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے پر زور دیا۔ وہ عوامی حاکمیت کا زبردست حامی تھا اور کلیسا کو اپنے مخصوص میدان (روحانی دنیا) تک محدود کرنے کا مبلغ (2)۔

اٹلی نژاد مفکر Divine Comedy اور De Monarchia کے مشہور مصنف ڈانٹے الیگوری (Dante:125-1321) نے بادشاہت کو بہترین طرز حکومت قرار دیا۔ وہ انسانی معاشرے کی بہتر تنظیم کے لیے اسے ضروری قرار دیتا ہے۔ اس نے دین وسیاست کے لیے، دو مختلف دھاروں میں چلنے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دینے پر زور دیا۔

اس کے خیال میں مکمل اقتدار کا سرچشمہ خداوند ہے، جس نے پوپ اور بادشاہ کو اختیارات سونپے ہیں۔ ایک کو روح کی بالیدگی اور دوسرے کو ریاستی خوشحالی کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ تاہم ان دونوں کے لیے عزت عوام کا فرض ہے۔ اس نے

(1) See for details: Will Durant, *Ibid*, p-251 (2) *Ibid*, p-249

اطالوی باشندوں کو دنیا کی امامت کے لیے، موزوں قرار دیا۔ روم کے عوام کو وہ اس لیے برتر سمجھتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہاں سے انسانیت کی تعلیم شروع کی تھی۔

کلیسا کا ایک اور ناقد، پائر ڈیوبائس (Pierre Dubios) تھا جس نے یہ تجویز پیش کی کہ کلیسا کی املاک عوام میں تقسیم کی جانی چاہئیں۔ وہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کا حامی تھا۔ البتہ اس نے فرانس کی قوم کو دنیا میں برتر قوم قرار دیا اور عالمگیر قیادت کے اہل گردانا۔ وہ ایک ایسی عالمی ریاست کا خواہاں تھا جو اہل فرانس کے زیر قیادت ترتیب پائے۔ وہ صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کے اتحاد کا علمبردار تھا۔ (1) گویا قومیت پرستی کے ابتدائی بیج بونے والا یہ پہلا مفکر تھا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جان وائکلف (Wicliff) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس کے بقول حکومت اللہ تعالیٰ کے منشا سے وجود پاتی ہے۔ مستحق انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقتدار ملتا ہے۔ کلیسا، خدا اور انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ اسے دنیاداری کے معاملات سے دور رہنا چاہیے۔ وائکلف نے انجیل کو معیار قرار دے کر عیسائی قومیت کی تعلیم دی۔ اس کے خیال میں پادریوں کو حکومت کے ماتحت کام کرنا چاہیے۔ وہ بادشاہت کے طرز حکومت کو بہترین قرار دیتا ہے۔

وائکلف کے پیروکار جان ہس (Huss.1415-1363.) نے ان خیالات کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دی اور یوں پاپائیت کو جڑ سے اکھاڑنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس تحریک میں کارڈینل نکولس اور اینس سلوئیس پیش پیش رہے۔

تحریک کلیسا Church Movement کے ان مفکرین نے جمہوری نظریات پیش کیے۔ جس میں پاپائیت کی بالادستی کا خاتمہ، قانون کی حاکمیت اور عوام الناس کی اہمیت و مساوات کے پہلو اجاگر کیے گئے۔ (2)

---

(1) Will Durant, ***Ibid***, p-251, (2) ***Ibid***, p-30, 32

اسی تحریک کو بیداری کی اس ابتدائی کروٹ کا نام دیا جائے گا، جو بعد میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنی۔ ریاست میں عیسائیت کی سیاسی مداخلت کے خلاف ردعمل کا یہ پہلا دور تھا۔

وائکلف نے پاپائیت کی دنیا پرستی کی مذمت کی، اخلاقی اقدار پر زور دیا، اور پادری کی اجارہ داری پر تنقید کی۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی وسیلے کا انکار کیا۔ یوں وہ اصلاح مذہب وتمدن کا علمبردار ٹھہرا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحریک اصلاح اسی سے شروع ہوتی ہے:

All the major elements of the Reformation were in Wyclif.(1)

حاصل مطالعہ

☆ یونان وروما سے جمہوری اور دستوری روایات، وراثت میں پانے کے باوجود، یورپ کے قرون وسطیٰ، سیاسی وسماجی سطح پر جمہوریت کی ترویج سے محروم رہے۔ مذہب عیسائیت اگرچہ اس خطے میں تہذیب وتمدن کے ایسے اصولوں کی روشنی میں پروان چڑھا، جو انسانی مساوات اور حقوق انسانی کی بنیاد بن سکتے تھے، مگر بادشاہوں کی خودمختاری اور کلیسا کی، اختیارات میں برتری، جمہوریت کے فروغ میں رکاوٹ بنی رہی۔

☆ ابتدائی قرون وسطیٰ میں عیسائیت کے عروج نے اگرچہ یورپ کے انسان کو مہذب، ہمدرد اور معاشرے کا خادم بنانے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ اس کی آزادی کو تحفظ یا نشوونما دینے والا نظام مہیا نہ کرسکی۔ البتہ خدائی حاکمیت اور عالمگیر ریاست کے خواب، افراد معاشرہ کو آفاقی نصب العین دینے میں مؤثر رہے۔ اسی طرح سرکاری سطح پر لاطینی زبان کی وسیع ترویج، خطے کے ممالک میں ہم آہنگی

(1) Will Durant, ***Ibid***, p-163

کا باعث بنی۔ —

☆ پانچویں صدی عیسوی کے بعد، مذہب کی سرکاری سرپرستی نے، اس ادارے کو غیر معمولی قوت سے نوازا، جس نے اسے اخلاقی بدحالی اور سماجی ظلم کی جانب گامزن کردیا۔ شاہی ایوانوں میں مذہب اور مذہبی اداروں میں شاہانہ طرز زندگی سرایت کر گیا۔ جہالت، غربت اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار عوام الناس کی زندگی، مذہب و سیاست کے گٹھ جوڑ نے اجیرن کردی۔

☆ کلیسائی افکار نے خدائی حاکمیت اور قانون فطرت کی تشریح کرتے ہوئے خدائی ریاست کا تصور پیش کیا۔ مطلق العنان بادشاہت نے خدائی نمائندگی کا دعویٰ لیکر اسے اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کردیا جبکہ پاپائیت، اسی کی بدولت حکومت پر اپنی برتری ثابت کرنے میں لگی رہی۔

☆ آخری ازمنہ وسطیٰ میں سیاسی و مذہبی اجارہ داری کے خلاف ردعمل پیدا ہوا، جس سے ان دونوں معاشرتی اداروں میں اصلاح کی ضرورت، ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ سیاسی مفکرین دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ حکومت پر مذہب کی اجارہ داری جبکہ دوسرا، مذہب کو حکومت کے زیر نگیں کرنے کا مدعی تھا۔

☆ ابتدائی قرون وسطیٰ میں مذہب و سیاست کی یکجائی اور آخری ازمنہ وسطیٰ میں ان دونوں کی باہمی تفریق کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اس دور میں اگرچہ یورپ، اخلاقی زوال اور سیاسی انارکی کا شکار رہا مگر دوسری طرف یہی وہ عہد ہے جب تحریک اصلاح کا ابتدائی نقشہ بننے لگا اور یورپی انسان نئی سوچ اور نئے سماجی نظام کی طرف بڑھنے لگا۔

باب چہارم

جدید جمہوریت کا ارتقاء اور کارہائے نمایاں

نشاۃ ثانیہ

تاریخ انسانی میں جمہوریت کی نشو ونما کے بنیادی حوالے یونان وروما تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ ریاستیں جو سلطنت روما کی براہ راست یا بالواسطہ زیر نگرانی رہیں، ترقی پا کر دور جدید کا یورپ بنیں۔ اس لحاظ سے جدید جمہوریت کا گھوارہ یورپ قرار پاتا ہے۔ سیاسی طور پر ترقی یافتہ، آج کے یورپ کا جائزہ لینے کے لئے مؤرخین نے یورپ کی مجموعی اور عمومی تاریخ کو درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ پانچویں صدی قبل مسیح تا پانچویں صدی عیسوی: یونانی (Greek) اور رومی دور (Roman Period)

۲۔ چھٹی صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی: عیسوی دور اور ازمنہ وسطی (Dark Ages)

۳۔ پندرھویں اور سولہویں صدی: تحریک اصلاح (Enlightenment)، نشاۃ ثانیہ (Renaissance)

۴۔ سترھویں سے بیسویں صدی: عقلیت اور سائنس (Age of Reason & Science)، اور اس کے بعد دور جدید۔

سولہویں صدی عیسوی میں مذہبی اجارہ داری کے خلاف ردعمل کا ایک عمومی اظہار، عالمگیر صورت اختیار کر چکا تھا۔ گیارہویں صدی سے چودھویں صدی تک مقدس سلطنت روم پر کلیسا کے غلبے نے جس نفرت کے بیج بوئے تھے وہ چودھویں سے

سولہویں صدی عیسوی تک کی قومی بادشاہتوں کے لئے شعلہ جوالہ بن چکے تھے۔ صدیوں کی گھٹن نے تحریک اصلاح کی صورت میں یورپ کو نئی روشنی Enlihgtenment کی طرف بڑھادیا جونشوونما پا کر یورپ کی نئی زندگی Renaissance میں تبدیل ہوگئی۔ سیاسی وسماجی حوالوں سے یہ ایک ایسا دور بلاخیز ہے جس میں علمی، ادبی، سیاسی اور عملی پہلوؤں کے لحاظ سے یورپ کے انسانوں کو نئی زندگی کا تحفہ ملا۔

نشاۃ ثانیہ کا پس منظر بارہویں اور تیرھویں صدی کی اس بیداری سے ترتیب پایا تھا جس کا تانا بانا یونانی علوم کی ترویج اور مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کی صلیبی جنگوں (Crusades) نے بنا تھا۔

''صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ء۔۱۲۹۱ء) کا ایک خوش آئند نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے لاکھوں افراد نے شام اور فلسطین جا کر برتر اسلامی تہذیب کا بچشم خود مشاہدہ کر لیا...... دوسری طرف اسلام کے تہذیبی اثرات اندلس اور صقلیہ کے راستہ اہل یورپ میں نفوذ کررہے تھے۔''(1)

گویا یورپ کی اس تہذیبی ترقی میں مسلمانوں نے یوں حصہ لیا کہ انہیں ثقافت اور تمدن کے نئے اصول فراہم کردیئے۔ جیسا کہ فلپ حتی Philip Hitti نے لکھا ہے کہ:

No People in the Middle Ages contributed to human progress so much as did the Arabians and the Arabic speaking people.(2)

(قرون وسطی میں کسی اور قوم نے انسانی ترقی میں اتنا حصہ ادا نہیں کیا جتنا کہ عربوں نے اور عربی زبان بولنے والوں نے کیا۔)

(1) سید محمد سلیم، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی جائزہ:16

(2) Philip K. Hitti, History Of The Arabs, p-4

لہٰذا یورپ کے ساحلی علاقوں میں شہری ترقی کا آغاز ہونے لگا:۔

The renaissance of the towns began in Italy in the Mediterranean ports, which had commercial relations with Constantinople and the Arabic countries which were then more civilized than Europe, and it penetrated into France and Germany through the seaports on towns situated on the highways of international commerce.(1)

(شہروں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی کے ساحلوں پر، بندرگاہوں سے ہوا جن کے تجارتی رابطے قسطنطنیہ اور عرب ممالک سے تھے، خصوصاً وہ جو اس وقت کے یورپ سے زیادہ تہذیب یافتہ تھے۔ پھر ان کے اثرات فرانس اور جرمنی میں سمندری بندرگاہوں اور عالمی تجارتی شاہراہ پر موجود شہروں کے ذریعے سرایت کر گئے۔)

دوسری طرف یونانی علوم کی ترویج، انہیں فکر و فلسفہ کی نئی روشنی سے ہمکنار کر رہی تھی۔ اس لحاظ سے بارہویں اور تیرہویں صدی تعمیری سوچ اور تمدنی ترقی کے ابتدائی بیج بو رہی تھی۔

The twelfth century is a creative and constructive era, and the development of thought and of life is extra-ordinarily rapid in all directions.(2)

(بارہویں صدی، ایک تخلیقی اور تعمیری دور تھا جب زندگی اور نظریۂ زندگی نے غیر معمولی رفتار کے ساتھ تمام جہتوں میں ترقی کی۔)

فکری و عملی بیداری کی ان لہروں نے یورپ کی سیاسی و سماجی زندگی پر حاوی، مذہب عیسائیت کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا۔ صدیوں کی معاشرتی گھٹن نے چودہویں اور پندرہویں صدی سے شروع ہونے والی تحریک اصلاح

(1) Encyclopaedia Britanica Vol-VIII, p-849

(2) Maurice De Wulf, Philosophy And Civilization In the Middle Ages, p-16

(Reformation) کے ذریعے دم توڑا۔

اصلاح کی تحریک کا آغاز مارٹن لوتھر (Martin Luther, 1483- 1546) نے کیا ایراسمس (Erasmus) نے انگلستان میں، زونگلی (Zwingly) نے سوئٹزر لینڈ میں اور کال ون (Calvin) نے جنیوا میں اس کو آگے بڑھایا۔ تحریک اصلاح نے پوپ کے اختیارات کو چیلنج کیا، مذہب کی تشریح کا حق مانگا اور نعرہ لگایا کہ جو بات عقل کے خلاف ہے، وہ خدا کے بھی خلاف ہے۔(1)

یہ تحریک کلیسا کی اجارہ داری پر کڑا وار ثابت ہوئی۔ پورا یورپ بھونچال کا شکار ہو گیا جس میں عوام و خواص کلیسا کے خلاف معرکہ آراء ہو گئے۔ اس جنگ میں کلیسا ناکام ہو گیا۔ مسیحیت اور بادشاہت سے بیزار انسان نے یونان و روما کے گم گشتہ فلسفوں میں پناہ تلاش کی اور یوں نئے ذوق شوق سے، اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے جدوجہد شروع کی جسے آج نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے اس تحریک کا رخ مذہب دشمنی کی طرف ہو گیا۔ مذہب عیسائیت کا وہ ایڈیشن جو قرون وسطیٰ میں یورپ پر حاوی رہا، لوگوں کو نفرت کے جہنم میں دھکیلنے کا سبب بنا۔ بادشاہت کے ساتھ گٹھ جوڑ اور خود اپنے اندر بے راہ روی در آنے سے، کلیسا پر لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا۔ جس کے نتیجے میں ''شاہی پاپائیت'' یا ''پاپائی بادشاہت'' کے خلاف نفرت نے جنم لیا۔ عیسائیت کے انکار سے آگے بڑھ کر، لوگوں نے مطلقاً مذہب سے ہی راہ فرار اختیار کر لی۔ مذہب سے بغاوت کے بعد اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہدایت الٰہی کے بجائے انسانی عقل اور علوم پر انحصار کیا جائے۔ وحی کا علم یورپ میں پہلے ہی تحریف شدہ تھا۔ اب ایک خلا پیدا ہوا جسے یونانی علوم کی ترویج کے ذریعے پر کیا گیا۔ بقول حسن عسکری:

---

(1) See for details: Maurice De Wulf, Philosophy And Civilization In the Middle Ages, p-16,

شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص ۳۵۴

"پندرہویں صدی میں سب سے اونچی جگہ یونانی علوم کو دی گئی۔ یہ علوم وحی پر مبنی نہیں تھے، بلکہ عقلی تھے۔ دوسرے یونانی علوم میں ہر مسئلے پر انسانی نقطہ نظر سے غور کیا جاتا تھا اور انسان ہی کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ "نشاۃ ثانیہ" کا اصلی مطلب ہے وحی پر مبنی علوم کو بے اعتبار سمجھنا، اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا، اسی لئے اس تحریک کا دوسرا نام "انسان پرستی (Humanism)" بھی ہے۔"(1)

نشاۃ ثانیہ نے ایک نئے انسان کو جنم دیا۔ یہ انسان اخلاقی و مذہبی لحاظ سے آزاد منشی (Liberalism) کی طرف مائل ہوا۔ فرد کی عظمت اور اہمیت کے تصور نے اسے احساس برتری میں مبتلا کر دیا۔ قومی وقار اور قومی و ملکی ترقی کے جذبے کے تحت قومیت پرستی (Nationalism) کا متوالا بنا اور سیاسی حقوق کے لحاظ سے جمہوریت (Democracy) کا متلاشی ہوا۔ لبرلزم نے ترقی پا کر لامذہبیت (Secularism) کی شکل اختیار کی اور قومیت پرستی انتہاء کو پہنچ کر فاشزم (Fascism) کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جدید انسان کا یہ طرز فکر و عمل جدید جمہوریت کو ایک طرز حکومت سے پورے طرز زندگی میں تبدیل کرنے کا باعث بنا۔ اسی بنیاد پر آج جمہوریت ایک عالمگیر اسلوب حیات (Universal Religion) کے طور پر مقبول ہے۔

جمہوریت کا اداراتی ارتقاء

(Institutional Evolution)

سیاسی تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ دور قدیم سے ہی انسانی معاشروں نے اپنی سماجی زندگی کو منظم کرنے کے لئے معاشرتی اداروں کو ترقی دینا شروع کر لیا تھا۔ ابتدائی جمہوریت کی تحقیق میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ قدیم انسانی معاشرے اقتدار میں رعایا کو شریک کرنے کے لئے اپنے حالات اور ضرویات کے مطابق

(1) جدیدیت: 35

ادارے ترتیب دیتے تھے۔ اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے کہ حکومتی عہدوں پر تقرری کے لئے خفیہ رائے دہی کا نظام بھی قدیم دور میں موجود تھا:

The Sumerians are said to have established rotation of office, annual appointments and election by secret ballot.(1)

اسی طرح یونان کی شہری ریاستیں (جن کے حکومتی اداروں کی تفصیل پہلے آ چکی ہے) باقاعدہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کا نظام رکھتی تھیں۔ اسی بنیاد پر ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) یونانیوں کو ہی ووٹ کا موجد قرار دیتا ہے:

The Greeks probably invented the use of formal voting procedures to legitimate decisions..(2)

یونان کے بعد جمہوریت کے ارتقاء میں روم کا نام آتا ہے۔ اگرچہ اپنے ابتدائی دور میں سلطنت روما کوئی مثالی کردار ادا نہیں کر سکا جیسا کہ سالٹاؤ (Soltau) لکھتا ہے:

Rome never became a democracy on the Athenian model ...(and)).. the contribution to politics of Rome as a City-State and a republic is therefore negligible...

تاہم اس نے تسلیم کیا ہے کہ رومیوں کی طرف سے ریاست کی انتظامی تقسیم اور دستوری حسن انتظام کا کارنامہ، اداراتی ارتقاء میں بنیادی کردار کا حامل ہے:۔

Only in the development of municipal autonomy did she make anything permanent in the way of institutions.(3)

رومی قانون یونانی فلاسفہ کے رومی شاگردوں کی زیر نگرانی تیسری اور چوتھی صدی میں ارتقاء پذیر ہوا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں مذہب عیسائیت کو سرکاری حیثیت حاصل ہوئی تو کلیسا کی گرفت سیاسی معاملات میں مضبوط ہونا شروع ہوگئی۔ مذہب عیسائیت نے سلطنت روما کو سماجی آداب اور تہذیب وتمدن کی بنیادی اقدار

(1) R.H. Soltau, An Introduction To Politics, p-61
(2) Models Of Democracy, p-21 (3) Soltau, *Ibid*, p-65

کے ساتھ منظم اور مستحکم ادارے بھی مہیا کئے۔ ول ڈیوراں (Durant) کے بقول:

.Above all, the Church at her zenith gave to the states of Europe an international code and government. (1)

نہ صرف یہ بلکہ معاشرے کے تمام سماجی اداروں کو بنیادوں سے استوار کیا:

For a thousand years, from Ambrose to Wolsey, it was the Church that trained western Europe's teachers, scholars, judges, diplomats, and ministers of state; the medieval state rested on the Church.(2)

ازمنہ وسطٰی کا اہم ترین سیاسی کارنامہ نمائندہ حکومتوں کا قیام ہے جو موجودہ جمہوریت کی ایک امتیازی اور بنیادی خصوصیت ہے۔ نویں صدی عیسوی میں یورپ تین حصوں اٹلی، فرانس اور جرمنی میں تقسیم ہو گیا۔ آبادی بڑھنے، قوانین کے پیچیدہ ہونے، حکومت کے ایک فن بن جانے اور سیاسی و معاشی حالات بدلنے سے رفتہ رفتہ یہ طریقہ رائج ہونے لگا کہ مختلف علاقوں کے باشندے اپنے نمائندے مقرر کر دیتے، جو حکومت کے کاموں میں حصہ لیتے۔ (3)

They also discoverd the idea of representation, which solved the problem of democratic government in large communities and stressed the concept of authority as a trust. (4)

اٹلی کی شہری ریاستوں میں سیاسی تنظیم کا ارتقاء گیارہویں صدی کے آخری دور میں شروع ہوا جس کا عملی مظہر Milon,Genoa کا Consular System تھا جو بارہویں صدی تک ایک حکومتی ادارے یا ہیئت حاکمہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نظام کو چلانے کے ذمہ دار Pedesta کہلاتے۔ تیرہویں صدی کے وسط میں بہت سی قابل ذکر Communes نے آزاد شہری جمہوریتوں کا مقام حاصل کر لیا۔

(1) The Story Of Civilization, The Reformation(I), p-6
(2) ***Ibid***, p-5, (3) Encyclopaedia Britanica, Vol.VIII, p-849
(4) Soltau, ***Ibid***, p-163

جان ڈن (John Dunn) کی تحقیق کے مطابق صرف یہی نہیں بلکہ ان ریاستوں میں ایسی سیاسی فکر پروان چڑھی جس میں عوام کی حاکمیت کے حق میں پہلی دفعہ دلائل ترقی پا رہے تھے۔ اور ایسی کتابیں لکھی جا رہی تھیں جنہوں نے جمہوریت کی راہ ہموار کی اور نظری جمہوریت نے خوابوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں باقاعدہ اداروں کی شکل اختیار کر لی۔(1)

نمائندہ حکومت کا آغاز انگلستان میں اس وقت سے ہوا جب ہنری دوم نے بارہویں صدی میں علاقائی عدالتی نمائندوں کو شاہی امور میں اہمیت دی۔ تیرہویں صدی میں مختلف علاقوں کے منتخب نمائندوں کے لئے (شاہی فرمان کے ذریعے) مجلس شاہی میں شرکت ضروری قرار دی گئی۔ اسی مجلس کے ارتقاء نے ایک قانون ساز ادارہ کی شکل اختیار کر لی۔ ہنری دوم کے عہد میں عدالتوں نے دستور و قانون کو ترقی دی جس سے معاشرے کے عام طبقات کو اپنے حقوق کا شعور اور ان کے حصول کا راستہ ملا۔ اس شعور نے ۱۲۱۵ء میں شہنشاہ جان کے ہاتھوں میکنا کارٹا (Magna Carta) حاصل کیا جو سیاسی حقوق کے حصول میں بہت بڑا سنگ میل تھا۔ اس سے پہلی دفعہ حکومت کو بھی قانون کا پابند بنایا گیا اور رعایا کے حقوق کا تعین ہوا۔(2)

تیرہویں صدی عیسوی سے یورپ میں قانون ساز اسمبلیوں (Lagislative Assemblies) نے ترقی پانا شروع کی۔ برطانیہ (England) میں پارلیمنٹ (Parliament) سپین (Spain) میں Cortes، فرانس (France) میں Estats اور جرمنی (Germany) میں Landtag کے نام سے ان اداروں نے استحکام حاصل کیا۔(3)

---

(1) See for details:Democracy - The Unfinished Journey, p-54

(2) شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت: 211

(3) Encyclopaedia Britanica, Vol-VIII, p-849

چودہویں صدی کے آغاز میں برطانوی پارلیمنٹ کے دو ایوان بنے جو House of Lords اور House of Commons کے نام سے کام کرنے لگے۔ دارالعوام نے آہستہ آہستہ قانون سازی کے اختیارات بھی حاصل کر لئے۔ برطانیہ کے بعد فرانس میں چودہویں صدی کے آغاز میں تین ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ اگرچہ اختیارات کے لحاظ سے اہل کلیسا اور امراء کے ایوان عوام کے ایوان پر ترجیح اور فوقیت رکھتے تھے، تاہم انتخابی اصول اور عوامی نمائندگی کا ارتقاء جاری رہا۔(1)

بہر حال اس سلسلہ میں برطانیہ کا کردار ہمیشہ سے مثالی رہا:

Only in Britain did perliaments not only survive but ultimately take to themselves the reality of power.(2)

جمہوری فکر کے نقیب ...... جدید سیاسی مفکرین

میکیاولی(Machiavelli:1469-1527): غیر مذہبی سیاسی نظریات کا نقیب

میکیاولی ازمنہ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کا درمیانی پل، معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایڈورڈ میکز نے (Edward Mcchesney) کہتا ہے:

Machiavelli was the child of florence and of the renaissance.(3)

اس نے اٹلی کے علمی وفکری گھوارے میں پرورش پائی۔ عہد وسطیٰ کے اختتام پر اٹلی، وینس، نیپلز، میلان اور چرچ کی شہری ریاستوں پر مشتمل ایک علاقہ تھا جو جاگیرداری، مذہبی اجارہ داری اور شاہی جبر کے چنگل میں بری طرح گرفتار تھا۔ ایسے میں میکیاولی نے سیاسی فلسفہ سے زیادہ عمل کی ترقی اور بہتری کو ہی مستقبل کی ضرورت

(1) شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت:217

(2) Soltau, An Introduction To Politics, p-72

(3) Masters Of Political Thought, p-26

جانا اور ایک نئی فلسفیانہ روایت ڈالی:

With Machiavelli, we breathe the modern air.(1)

میکیاولی وہ پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے ''ریاست'' کا لفظ استعمال کیا۔ اس نے پہلی بار غیر مذہبی، خودمختار، علاقائی حکومت کا تصور پیش کیا اور روحانی دنیا کے معاملات سے الگ ہو کر مادی زندگی کے ٹھوس حقائق کی بات کی۔ مگر اس سلسلہ میں ذرا آگے بڑھتے ہوئے اس نے اخلاقیات کو سیاسی امور سے الگ کر دیا حتیٰ کہ سیاست میں ہر (اخلاقی برائی نام کی) چیز کے جائز ہونے کا دعویٰ اور فلسفہ پیش کر دیا۔ اس کے خیال میں ریاست کا تحفظ اور اس کی بہتری ہر چیز سے بالاتر ہے لہذا اگر یہ مقصد اخلاقی اصول کو ایک طرف رکھ کے حاصل ہوتا ہو تو ایسا کر لینا چاہیے:

... in politics there can be no "Wrong" or "Right"in any moral sense. (2)

(سیاست میں اخلاقی پیمانوں پر، کوئی چیز 'غلط' اور 'صحیح' نہیں ہوتی۔)

اپنی کتاب The Prince میں میکیاولی نے ایسے بادشاہ کا تصور پیش کیا جو سیاسی کامیابی اور ریاستی ترقی کے لیے جائز و ناجائز کے دائروں سے ماورا تھا۔ اس کے خیال میں جب ریاست کا وجود ہی خطرے میں ہو تو بادشاہ کے لیے اخلاقی اور معاشرتی اصطلاحات اپنا مفہوم کھو دیتی ہیں یا اپنے معانی بدل لیتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں اسے محبّ وطن ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے انصاف، رحم اور اخلاق کی تشریح، ضرورت کے مطابق کرنی چاہیے۔

Machiavelli was above and beyond all else a prophet and a preacher of the principle of patriotism and the idea of the national state.(3)

---

(1) Leo Bauch, The Political Animal, p-1, (2) *Ibid*, p-2
(3) Hearnshaw, The Social And Plitical Ideas Of Some Great Medieval Thinkers, p-112

(میکیاولی، حب الوطنی کے اصول اور قومی ریاست کا سب سے بڑھ کر علمبردار اور مبلغ تھا۔)

جذبہ قوم پرستی سے معمور یہ عمل پسند سیاستدان، پاپائیت کے سخت خلاف تھا۔ اس کے خیال میں پوپ اٹلی کی تقسیم اور انتشار کا باعث تھا۔ اور سلطنت روما کا زوال عیسائیت کی تاریخی شکست اور ناکامی کا منہ بولتا ثبوت!(1)

میکیاولی کے سیاسی افکار اس کی دو کتابوں The Prince اور Discourses میں ملتے ہیں اول الذکر بادشاہ اور حکومت سے متعلق جبکہ دوسری ریاست کی توسیع وغیرہ سے متعلق ہے۔

Machiavelli,s whole emphasis is simply on the art of maintaining onself in power.(2)

(میکیاولی کا سارا زور اس فن پر ہے کہ کس طرح حکومت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے؟)

وہ ارسطو کے نظریہ گردش حکومت سے متاثر اور اس کا حامی تھا۔ اس کے خیال میں حالات کے مطابق حکومت کی شکل اور ہیئت بدل لینی چاہیے۔ وہ ایسی جمہوری حکومت کو ترجیح دیتا ہے جو عوام میں اقتصادی مساوات قائم کرے اور آزاد معاشرہ تخلیق کرے۔ اس کے خیال میں حاکم قانون ساز ہوتا ہے، اس کا بنایا ہوا قانون ہی قوم کا اخلاق ہوتا ہے۔ حکام کو مذہبی اور اخلاقی پابندیوں سے ماورا ہو کر صرف جذبہ حب الوطنی کے تحت کام کرنا چاہیے۔ حکومت کی اس قومی خدمت کے مقابلے میں کوئی اور ضابطہ اخلاق نہیں لایا جانا چاہیے۔

میکیاولی کے افکار کو بقول لیو باخ (Leo Bauch) ہم مختصراً تین نکات میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

(i)Amoralization(ii)Nationalization(iii)Secularization.(3)

---

(1) See for details: James Wiser, Political Philosophy, p-137
(2) See for details: Edward Mcchensney, Masters Of Political Thought, p-2
(3) See for details: Leo Bauch, Political Animals, p-2

(اخلاقی اصولوں کی نفی، قومیت پرستی، لادینیت)

ژین بودین(Jean Bodin:1530-1596): عملی سیاسیاست سے تعلق رکھنے والا یہ فرانسیسی مفکر ریاست کو کنبے سے مماثل قرار دیتا تھا۔ اقتدارِ اعلیٰ کے جدید نظریئے کی سب سے پہلی وضاحت بودین نے ہی کی ہے۔ اس کے بقول:

Sovereignty is the absolute and perpetual power.(1)

(اقتدارِ اعلیٰ مطلق اور دائمی ہوتا ہے۔)

بودین کے خیال میں ریاست قانون کی حکومت کا ہی نام ہے۔ ریاست کا حاکم خدا کا نائب ارضی ہے لہٰذا اس کی اطاعت، رعایا پر فرض ہے۔ وہ سب سے ارفع و اعلیٰ حاکمیت، اللہ کی حاکمیت کو قرار دیتا تھا۔ تاہم ریاست کے مقتدرِ اعلیٰ حاکم وقت (فرد یا جماعت) کو مانتا تھا۔ اس کے مطابق، اقتدارِ اعلیٰ پر قانون فطرت کے علاوہ کوئی اور قوت فرمانروا نہیں ہوتی:

Since there is nothing on earth greater than a sovereign prince, save God alone, and since sovereigns are established by God as His lietenants, to rule over men, We must take care that their mejesty be reverenced and respected and that they be always spoken of with honour(2)

(چونکہ زمین پر خود مختار بادشاہ سے زیادہ عظیم، سوائے خدا کے کوئی اور نہیں اور یہ کہ بادشاہ اور اس کے نائبین، خدا کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں تاکہ وہ عوام الناس پر حکومت کریں۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی عظمت و تکریم بجالائیں اور ان کے لئے ہمیشہ ادب کے الفاظ استعمال کریں۔)

گویا وہ اقتدارِ اعلیٰ کی مطلقیت کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں مقتدرِ اعلیٰ سرچشمۂ قانون ہے مگر خود قانون کی پابندی سے آزاد! آئین سازی میں عوامی امنگوں

(1) Edward Mechesney, Masters Of Political Thought, p-57

(2) *Ibid*, p-58

کی پاسداری کا خیال رکھنا اس کے لیے فرض نہیں۔ موروثی بادشاہت کا مؤید یہ سیاسی مفکر حاکم وقت کو لا متناہی اختیارات کا مالک گردانتا تھا۔ اس نے عوامی اکثریت کو نظرانداز کرنے کے لیے ریاست کے مفاد کی آڑ میں آمریت کی حمایت کی ہے۔

تھامس ہابز (Thomas Hobbes.1588-1679) نے ریاست کو قدرتی کی بجائے تخلیقی قرار دیا:

The state,the great Leviathan...that is artificial and the work of man.(1)

(ریاست ...... عظیم عفریت ...... ایک غیر قدرتی چیز ہے اور انسان کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔)

اس کے مطابق ریاست کے عوام حاکم کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کے تحت وہ سارے اختیارات اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ لا متناہی اختیارات کا مالک (دیوہیکل عفریت) بن جاتا ہے اور عوام اپنے حقوق سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے خیال میں بادشاہت، اشرافیہ اور جمہورت میں سے، بادشاہت ہی بہترین طرز حکومت ہے۔ وہ اشرافیہ اور جمہورت کو ذاتی مفادات اور اغراض میں الجھے ہوئے لوگوں کی حکومتیں سمجھتا ہے، جو اس کے خیال میں ریاست کے لیے مفید نہیں ہو سکتیں۔ جے۔ اے۔ موراں (Mourant) نے اس کا نقطۂ نظر یوں بیان کیا ہے:

To attain peace , men contract or covenant with one another and transfer those rights which they enjoyed in a state of nature, to a third party who agrees that the power or right which he has received in this way shall be used to preserve the peace and secure the lives and property of individuals.(2)

(امن کے حصول کے لئے، لوگ ایک دوسرے سے معاہدہ کرتے ہیں اور

(1) Leo Bauch, Political Animal, p-23

(2) J. A. Mourant, Problems of Philosophy, p-394

وہ حقوق، جو فطری حالت کے دور سے انہیں حاصل تھے، ایک تیسرے فریق کو منتقل کر دیتے ہیں، جو اس بات پر تیار ہو کہ وہ ان حقوق اور اختیارات کو امن کی حفاظت اور افراد کے جان و مال کے تحفظ کے لئے استعمال کرے۔)

ہابز صرف مقتدر اعلیٰ کو ہی قانون سازی کا حق دیتا ہے اس کے خیال میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ اس کی مرضی ہی قانون ہے۔ حتیٰ کہ وہ مذہب اور اخلاق کو بھی حاکم اور ریاست کے ماتحت قرار دیتا ہے۔ Leo Bauch نے ہابز کے اس تصور اقتدار اعلیٰ کو Representational Absolutim قرار دیا ہے (1) یعنی اقتدار کی ایسی مطلقیت یا مطلق العنانیت، جو نمائندگی کے اصول کے تحت اپنے آپ کو منواتی ہے۔

سترھویں صدی کا سیاسی مفکر اور مشہور کتاب On Civil Government کا مصنف جان لاک (John locke: 1632-1704) مطلق العنانیت کے علی الرغم بادشاہ کے انتخاب اور اس کے محدود اختیارات کا کا قائل تھا۔ اس نے انسان کے فطری حقوق زندگی، ملکیت اور آزادی پر خصوصی توجہ دی۔

اسی طرح اس نے بادشاہ پر عوام کو ترجیح دی اور انہیں اقتدار کا بنیادی سرچشمہ قرار دیا۔ اس کے بقول عوام نے ایک معاشرتی معاہدے (Social Contract) کے ذریعے سیاسی معاشرہ تشکیل دیا ہے لہذا انہیں یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کو اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے پر تبدیل کر سکیں۔(2) وہ اختیارات کی تقسیم کا قائل تھا اور قانون کے ذریعے عوامی حقوق کے تحفظ کا مؤید۔ لاک کے خیال میں انتظامیہ اور عدلیہ، مقننہ کے ماتحت ہیں، کیونکہ وہ عوام کی منشاء کے مطابق قانون سازی کرتی ہے۔(3)

گویا جدید جمہوریت کے بنیادی اصول کی وضاحت بہترین انداز

---

(1) See for details: Edward Mcchesney, Masters of Political Thought, p-157 (2) *Ibid*, p-171-172, (3) *Ibid*, p-197-199

میں جان لاک نے کی ہے۔اس کے خیال میں جمہوریت یعنی عوامی منشا کی حکومت جو انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرے، بہترین حکومت ہے:

It was Locke,s philosophy which prepared men, after giving expression to their own opinion , to accept the verdict of the majority.(1)

(یہ جان لاک ہی کا فلسفہ تھا جس نے افراد کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کر دینے کے بعد، اکثریت کے فیصلے کو قبول کر لینے والے بن جائیں۔)

اٹھارہویں صدی کی سیاسی فکر میں منفرد آواز فرانسیسی مفکر مونٹیسکیو (Montesquieu) کی ہے، جو انسانی آزادی اور اس کے فطری حقوق کا علمبردار تھا۔ اس نے انفرادی آزادی، آئینی طرز حکومت اور مذہبی رواداری کے لیے جدوجہد کی۔ وہ ریاست کو انسان کے معاشرتی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتا تھا اور اس سلسلہ میں کسی معاہدہ عمرانی کا قائل نہ تھا۔ جہاں تک طرز حکومت کا تعلق ہے، اس کا خیال تھا کہ اصل چیز یہ نہیں کہ حکومت کئی ہاتھوں میں ہے یا ایک (بادشاہ کے) ہاتھ میں...... اصل معاملہ یہ ہے کہ اس کی خصوصیات کیا ہیں۔اس نے حکومت کو مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے حصوں میں تقسیم کر کے ان کے اختیارات وفرائض کو تفصیل سے بیان کیا۔اس کے خیال میں جمہوریت سے مراد دراصل شہریوں کی براہ راست اختیارات میں شرکت ہے۔ایڈورڈ میکیز نے اس کی رائے کو یوں پیش کرتا ہے:

When in a republic, the body of the people is possessed of the supreme power, it is called democracy.(2)

(کسی عوامی جمہوریہ میں جب عوام ہی کا ایک منظّم ادارہ ، اعلیٰ ترین اختیارات کا حامل ہوتا ہے، تو وہ جمہوریت کہلاتی ہے۔)

---

(1) See for details: Northrop The Meeting Of East And West, p-184, (also see)Leo Bauch, Political Animal, p-60-70

(2) Edward Mcchesney, Masters of Poliltical Thought, p-229

وہ قدیم یونانی شہری ریاست کی طرح کے طرز حکومت کو مثالی جمہوریت قرار دیتا ہے۔اس کے خیال میں جمہوریت چھوٹی ریاستوں میں ممکن اور مفید ہے۔ درمیانے درجے کی ریاستوں میں بادشاہت زیادہ موزوں ہے جبکہ وسیع ریاست میں مطلق العنان بادشاہت کے بغیر چارہ نہیں۔اس نے انسانی آزادی کو بہت اہمیت دی تاہم قانون کے تحت زندگی گزارنے کو ہی سیاسی آزادی کا نام دیا ہے۔(1)

انقلاب فرانس کا نقیب والٹیر،(Voltaire)انسانی آزادیوں اور معاشرتی حقوق کا علمبردار تھا۔تاہم اس نے کسی خاص طرز حکومت پر زور نہیں دیا البتہ وہ عوامی حکومت کو بہترین حکومت سمجھتا تھا۔لیکن اس کے خیال میں کوئی جمہوریت انسانوں کو برابر نہیں رکھ سکتی۔وہ برطانوی طرز حکومت کو مثالی قرار دیتا رہا اور انسان کے سیاسی حقوق کے لیے مسلسل جدوجہد میں رہا......سیبائین(Sabine)کے بقول:۔

His onslaught on persecuting christianity was probably the greatest contribution to freedom of speech ever made.(2)

(مذہب عیسائیت کے خلاف اس کی قانونی جنگ، غالباً، آزادیٔ اظہار کے لئے،اس کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔)

جیکوئیس روسو(J.Jacques Rousseu:1712-1781)انسان کے یکساں حقوق کا علمبردار،عوامی جمہوریت اور سماجی زندگی میں سیاسی انقلاب کا یہ داعی، یونانی طرز کی جمہوریت کو پسند کرتا تھا۔اس کے خیال میں مہذب انسان، غلامی کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔رسوم ورواج کی جکڑ بندیوں میں زندگی گذارتا ہے۔سیاسی زندگی میں سماجی اداروں کی زنجیریں اسے باندھے رکھتی ہیں، مرتا ہے تو تابوت میں قید کردیا جاتا ہے، یوں وہ معاشرے پر قربان ہو جاتا ہے۔......ایڈورڈ میکنز نے روسو کا وہ مشہور جملہ لکھا ہے جو جمہوریت کے بنیادی نعرے کے طور استعمال ہوتا ہے:

(1) Sabine, A History of Political Theory, P-555-557

(2) *Ibid*, p-561, Will Durant, The Story of Philosophy, p-185

Man is born free; however he is everywhere in chains.(1)

(انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر ہر طرف سے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔)

روسو انسان کو معاشرے کے ایک پرزے کے طور پر استعمال ہوتے دیکھ کر کڑھتا رہا۔ وہ ہر شخص کی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے، اس کے لیے، مسرت کی راہیں متعین کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے خیال میں ہر شخص کو اپنے طبعی رجحان کے مطابق کوئی پیشہ اپنانا چاہیے۔ ریاست کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرنی چاہیے:

Each of us puts his person and all his power to the common use under the supreme direction of the general will; and as a body we receive each member as an indivisible part of the whole.(2)

(ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی تمام توانائیاں، اجتماعی مفاد کے لئے جھونک دیتا ہے، معاشرے کی اعلیٰ ترین قدر...... عمومی منشاء کے تحت! اور ایک جسم کی مانند، ہر فرد اپنے کل کا ایسا جزو ہے، جسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔)

روسو کے مطابق معاشرے میں اقتدار اعلیٰ اس منظّم ادارے کے پاس ہوتا ہے جو معاشرتی معاہدے (Social Contract) کے نتیجے میں معرض وجود میں آتا ہے۔ اس ادارے کا نام ریاست ہے جو عوام کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے انہی کے ارادہ عام (General Will) کے تحت کام کرتی ہے۔

گویا اقتدار اعلیٰ، ارادہ عام کو کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بقول ارادہ عام...... ناقابل انتقال، ناقابل تنسیخ، ناقابل تقسیم اور لامحدود ہے۔ اس لیے اقتدار اعلیٰ میں بھی یہی خصوصیات ہوتی ہیں۔

(1) Edward Mcchesney, Masters of Political Thought, p-257

(2) *Ibid*, p-265

It is a convention made by the whole body with each of its members----a convention which is just, because it rests on the social contract, equitable, because it is common to all; useful , because it has no other object than the general good; and permanent,because it is guaranteed by the public force and the supreme power.(1)

(یہ ایک مستحکم عہد ہے ہمارے سماجی ادارے کا اپنے ارکان کے ساتھ...... ایک ایسا عہد جس کی بنیاد ایک ایسے عمرانی معاہدے پر ہے جو منصفانہ ہے، کیونکہ وہ سب کے لئے ہے۔ مفید ہے، کیونکہ اس کا مقصد عمومی بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور یہ دائمی ہے کہ اس کی ضمانت عوامی قوت یعنی اعلیٰ ترین اختیار نے دی ہے۔)

روسو نے ریاست اور حکومت میں فرق قائم کیا ہے۔ اس کے خیال میں ریاست ایک معاشرتی معاہدہ ہے جو ارادہ عام کے تحت وجود میں آتا ہے جبکہ حکومت افراد معاشرہ کے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کرنے والی قوت کا نام ہے۔ گویا قانون سازی عوام کریں گے اور حکومت ان کی ایجنٹ کے طور پر ان قوانین کو نافذ کرے گی۔ افراد ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کو اصل مقاصد سے انحراف کرنے کی صورت میں تبدیل کر سکیں۔ لیکن یہ صرف تھوڑی آبادی والی ریاستوں میں ہی ممکن ہے۔ اس کی ضروری شرائط میں یہ شامل ہے کہ نچلی سطح تک تقسیم اختیارات ہو اور مساوات کے اصول کو سامنے رکھ کر افراد ریاست کو ایک جگہ جمع کرنا آسان ہو۔ ان شرائط کی عدم موجودگی میں روسو جمہوریت کو ایک ناممکن العمل خواب سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا:

Indeed , if we speak exactly ,there never has been, and there never will be a true democracy.(2)

(حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم نپی تلی بات کریں تو حقیقی جمہوریت کبھی معرض

(1) Edward Mcchesney, Masters of Political Thought, p-281
(2) *Ibid,* p-303

وجود میں آئی ہے نہ کبھی آسکتی ہے۔)

ایسی صورتحال میں وہ معاصر سیاسی نظاموں میں سے ایک معیاری قسم کی اشرافیہ کو بہتر قرار دیتا ہے جو قابل اور دیانتدار افراد پر مشتمل ہو۔ایسی حکومت سے عوامی بھلائی کی توقع کی جاسکتی ہے:۔

The best and most natural order is that in which the wisest govern the many , providing that we can be sure that they will govern the many for its profit and not for their own.(1)

روسو اپنے دور میں رائج جمہوریت کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کے خیال میں منتخب نمائندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والی جمہوریت، حقیقی جمہوریت نہیں، سراب ہے کیونکہ اس طرح ریاست کے اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جس پر وہ قائم ہوئی ہے اور وہ ہے ارادہ عام، جو کہ نا قابل انتقال ہے۔ بالواسطہ جمہوریت میں عوام الناس اپنے ہاتھوں سے ہی منتخب کردہ لوگوں کے رحم و کرم پہ ہوتے ہیں۔اقتدار میں نامکمل شراکت،عوام کی نامکمل آزادی ہے۔اسی لئے اس کے خیال میں انگلستان کے لوگ دھوکے میں رہتے ہیں جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ پارلیمنٹ کو منتخب کر لینا ہی آزادی ہے، حالانکہ وہ اب دوسری بار غلامی میں آچکے ہوتے ہیں۔

لیو باخ(Leo Bauch)نے اس کی یہ رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

Anything less than full participation is less than ful freedom, because it is by that much less an obedience to ourselves;and the less of freedom, the more of slavery.This is why English men are deceived when they think of themselves as free. After they elect parliament,the English are slaves once more.(2)

---

(1) Edward Mcchesney, Masters of Political Thought, p-304

(2) Leo Bauch, Political Animal, p-108

روسو کی نظر میں مثالی جمہوری حکومت وہ ہے جس میں عوامی اسمبلی ہی مقننہ ہوتی ہے اور وہی انتظامیہ...... تاہم یہ طرز حکومت چھوٹی ریاستوں میں کامیاب ہے، اور کسی ریاست میں طرز حکومت کا انحصار وہاں کے عوام کی سیاسی پختگی اور خواندگی پر ہے۔ روسو، مثالی حکومت اسے ہی قرار دیتا تھا، جس میں عوام براہ راست شریک ہوں۔

روسو کے ان خیالات کا اثر سیاسی دینا میں بہت وسیع حلقے پر ہوا اور اٹھارہویں صدی کے بعد کے سیاسی انقلابات کا سررشتہ، روسو کے افکار سے ہی جا ملتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ جدید سیاسی فکر اور اس کے اداراتی ارتقاء کا بانی ٹھہرتا ہے۔

جمہوریت نے انسان کو کیا دیا؟

دستوری جدوجہد اور حکومتی ادارے

برطانیہ میں میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کے ذریعے جمہوری حقوق کو تحفظ حاصل ہوا تھا جس سے پارلیمنٹ مضبوط ہوتی گئی لیکن اس سے بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان اختیارات کی کشمکش شروع ہوگئی۔ تیرھویں سے سترہویں صدی عیسوی تک یہ جنگ کسی نہ کسی صورت جاری رہی۔ پارلیمنٹ نے اگر ۱۳۹۹ء میں شاہ رچرڈ دوم کو تبدیل کر کے برتری حاصل کی تو بادشاہت نے جیمز اول کی صورت میں حقوق ربانی کا دعویٰ لیکر بادشاہ کو قانون سے بالا تر قرار دلوایا۔ اسی طرح سترہویں صدی کے وسط میں پارلیمنٹ نے اقتدار میں بالاتری حاصل کرنا چاہی تو فوج نے حکومت پر قبضہ کرلیا اور ملوکیت کا خاتمہ کر دیا۔ البتہ اسی دور (۱۶۴۹ـ۱۶۴۵ء) تک levellers کی تحریک مؤثر رہی۔ ۱۶۴۹ء میں پارلیمنٹ میں ''معاہدہ عوام'' کے نام سے جو تجاویز پیش کی گئیں وہ عوامی اقتدار کو دستوری حیثیت دینے کی پہلی کامیاب اور تاریخی کوشش تھی۔ (1)

کراموبل (Cromwell) نے چاہا کہ دستوری حکومت قائم ہو جائے مگر ملک میں بدامنی کی صورتحال، فوجی حکومت کی متقاضی تھی۔ ۱۶۶۰ء میں چارلس دوم کی تخت نشینی سے آئینی بادشاہت قائم ہوگئی جبکہ پارلیمنٹ زوال کا شکار ہونے لگی۔ تاہم ۱۶۸۸ء کے ''شاندار انقلاب'' کے نتیجہ میں پارلیمانی نظام کا ارتقاء دوبارہ سے شروع ہوگیا۔ بادشاہ کے اختیارات میں کمی، کابینہ کی تشکیل اور اس کا پارلیمنٹ کے سامنے

(1) See for details: Will Durant, The Story Of Philosophy, p-305

جوابدہ ہونا...... یہ سب کچھ جدید جمہوریت کے ارتقاء کی جانب اہم سنگ میل ہیں۔ جو تقریباً ڈیڑھ صدی کی جدوجہد کے ذریعے ۱۸۴۸ء کے عوامی منشور پر منتج ہوئے۔ جس میں تمام بالغوں کے لیے حق رائے دہی کا اصول، انتخابی اصلاحات اور دارالعوام کی برتری جیسے مراحل طے کیے گئے۔ یہ دستوری حاکمیت اور عوامی اقتدار کے ارتقاء کا سنہری دور ہے، جب برطانیہ کی مثال اپنا کر، اٹلی، فرانس، اور جرمنی سمیت تمام یورپی ممالک (سویڈن، ڈنمارک، بیلجیئم، سپین، سوئٹزرلینڈ وغیرہ نے دستوری حاکمیت کی جانب سفر کیا۔(1)

فرانس میں پارلیمنٹ کا نام ''اسٹیٹس جنرل'' تھا جو تین ایوانوں پر مشتمل تھی۔ بادشاہوں نے ایوان کو اتنی اہمیت نہ دی کہ ان کا اجلاس ہی بلایا جاتا۔ ۱۷۷۶ء میں امریکی باشندوں کے اعلان آزادی نے فرانس کے لوگوں میں آزادی اور جمہوریت کے جذبوں کو مزید اجاگر کر دیا۔ لہٰذا عوام کا شعور اور جدوجہد تیزی سے ارتقاء پذیر ہوئی۔ عوام نے تینوں ایوانوں اور طبقوں کو ایک ایوان میں یکجا کرنے کا مطالبہ کیا جسے بادشاہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے ردعمل میں عوام نے اپنی اسمبلی کو ''قومی اسمبلی'' کا نام دیا اور جبر کے خلاف نبرد آزما ہو کر حقوق انسانی کا اعلان کر دیا۔ قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے دستور اور اعلان حقوق ۱۷۸۹ء نے جمہوریت کو نئی روح سے آشنا کر دیا۔ ۱۷۹۱ء میں دستور حکومت بنا کر قومی اسمبلی نے بادشاہ کے اختیارات کو محدود کیا اور ایک ایوانی مجلس قانون ساز قائم کی جس نے جدید جمہوریت کے کئی سنگ ہائے میل عبور کیے۔(2)

اس مجلس قانون ساز کے لیے دوسال کی انتخابی مدت کا تعین، ملک کے انتظام و انصرام کا نیا نظام، کونسلروں کا براہ راست انتخاب، انتخابی اور عدالتی امور کی

(1) John Dunn, Democracy, p-71

(2) Anrew Heywood, Political Idealogies, p-238

اصلاح اور ۱۷۲۹ء میں بالغ مردوں کے لئے حق رائے دہی...... یہ سب جمہوری سفر کے اہم مراحل تھے۔ مذہبی آزادی اور کلیسائی حکومتوں کی تنظیم نو بھی قومی اسمبلی کے کارناموں میں شامل ہیں۔ لیکن ۱۷۹۱ء میں (برطانیہ کی طرح) فرانس میں بھی حقوق ربانی کا دعویٰ لیکر آئینی یا دستوری ملوکیت دوبارہ قائم ہوئی تاہم وہ جمہوری تحریک کے ریلے کو روکنے میں ناکام رہی۔

۱۷۹۲ء میں جیکبین انقلاب شروع ہوا جس کے تحت بادشاہت کے خاتمہ کا اعلان ہوا۔ بادشاہ کو پھانسی دے دی گئی اور ''نیشنل کنونشن'' نے اقتدار سنبھال لیا۔ ۱۷۹۳ء میں اگرچہ ملکی دستور عوام کی اکثریت کی مرضی سے پاس کیا گیا تھا جو کہ ایک بہت بڑا جمہوری عمل تھا، مگر ''نیشنل کنونشن'' اور عوام کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی جس نے نپولین بوناپارٹ کی آمریت کا راستہ ہموار کر دیا۔

نپولین بوناپارٹ نے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ دی، تاہم قومیت پرستی اور انتظامی اصلاح، اسکی مقبولیت کا باعث بنے۔ اس نے فلاح و بہبود کی حکمت عملی اپنائی، مذہبی آزادی اور قانونی مساوات کو عام کیا۔ اہلیت کی بنیاد پر ترقی کو رواج دیا۔ اعلیٰ نظم ونسق اور ملکی ترقی و سربلندی کو یقینی بنایا۔ نپولین کا یہ عروج پورے یورپ میں عوامی فلاح و بہبود کی ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔(1)

اپنے ملک میں مقبول ہو جانے والا یہ آمر اور مطلق العنان حاکم، دیگر یورپی ممالک میں فروغ جمہوریت کا بنیادی محرک بن گیا۔ تاہم ۱۸۱۵ء میں والٹرلو کی شکست نے نپولین کے سیلاب کے سامنے ایک بند باندھ دیا۔ اور پھر ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک آمریت اور مطلق العنانیت نے فرانس میں جمہوریت کا گلا دبائے رکھا۔(2)

(1) Leonard Tivey, The Nation State, p-16

(2) Andrew Heywood, Political Ideologies, p-145-150

یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط میں لبرلز (Liberels) نے آزادی اور مساوات کی تحریک شروع کی جس نے معاشی اور مذہبی آزادی کی راہ ہموار کی ۔ اور یورپ کے اکثر ممالک میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرانس بلجیئم ، اٹلی ، اسپین ، پرتگال، امریکہ اور سوئٹزرلینڈ غرضیکہ ہر جگہ انقلابات نے جنم لیا۔ فرانس میں اس انقلاب نے قومی اسمبلی کو مضبوط کیا جو ۱۸۷۵ء تک بخیر وخوبی دستوری حاکمیت قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ قومی اسمبلی نے سیاسی اصلاحات کا عمل جاری رکھا اور پارلیمنٹ کے دوایوانوں کی منظوری دی، مدت انتخاب کا تعین کیا، ارکان کی تعداد، اجلاسوں کے اصول اور انتظامی اختیارات کا توازن قائم کیا۔ ایسے تمام اقدام کئے جن سے جمہوری تحریک اور دستوری حاکمیت ترقی پاتی گئی ۔ اس بنیاد پر سالٹاؤ (Soltau) نے مبنی برحقیقت یہ رائے دی ہے کہ دراصل جمہوریت کو کارناموں کی راہ پر گامزن کرنے والے اور جمہوری فکر وعمل کو دنیا میں حقیقی روپ دینے والے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے لوگ ہی ہیں :۔

Democratic theory is of Franco-swiss origin, and it is interesting to note that the earliest known communities that were definitely Political democracies were those set up by Swiss farmers in some of the oldest of the areas or 'cantons'.(1)

سیاسی ومعاشرتی آزادی

برطانیہ میں پارلیمانی نظام کی ترقی اور فرانس کے عوامی انقلاب کی طرح امریکی ریاستوں کی تحریک آزادی...... جدید جمہوریت کے استحکام میں بنیادی کردار کی حامل ہے۔ امریکہ میں برطانوی نوآبادیوں کے عوام نے سترہویں صدی عیسوی کے آغاز سے جمہوری تحریک شروع کی اور نصف صدی کی جدوجہد سے اپنے جمہوری

(1) Soltau, An Introduction To Politics, p-163

حقوق کے تحفظ کے لیے اسمبلیاں قائم کرلیں۔ برطانوی تاج نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھا، جس سے ایک طویل معرکہ آرائی کا آغاز ہوا۔جیمز دوم نے اسمبلیاں ختم کر دیں جبکہ عوامی دباؤ اور بغاوت کے خطرے کے تحت ولیم سوم کو پھر وہی نظام قائم کرنا پڑا۔ اٹھارہویں صدی میں برطانوی حکومت نے جب نو آبادیوں سے متعلق سخت قانون سازی کی اور ٹیکسوں کا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی تو سخت ردعمل پیدا ہوا۔اس کشیدگی کے دوران سیاسی مفکرین جان لاک، ٹامس پین، جیفرسن اور جارج میسن کے نظریات کے تحت امریکی ریاستوں میں انقلابی دساتیر کی تیاری شروع ہوئی۔(1)

۱۷۷٦ء میں دستور پنسلوانیہ، دستور ورجینیا اور اعلان آزادی...... تین نہایت اہم آئینی و جمہوری دستاویزیں مرتب ہوئیں جن میں جمہوری انقلاب کے علمبردار مفکروں کے تصورات پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔(2)

ورجینیا کے عوامی اجتماع میں بنیادی حقوق کا جو مسودہ جیفرسن کی مدد سے تیار ہوا تھا، وہی بعد میں امریکہ کے اعلان آزادی اور دستور کا روح رواں بنا۔اس میں انسانی آزادی کے فطری اصول، عوامی اقتدار کا جواز، مراعات یافتہ طبقے کا خاتمہ، حکومتی اداروں کی تفصیل و ترتیب اور عوام کی مذہبی، معاشی اور معاشرتی آزادی کے اصولوں کو قانونی تحفظ دے دیا گیا۔۱۷۷٦ء کے اعلان آزادی کے تحت تیرہ امریکی ریاستیں باہم متحد ہوکر جنگ آزادی میں شریک ہوئیں۔اور ۱۷۸۲ء میں جنگ آزادی کے اختتام پر مکمل طور پر آزاد مملکت میں تبدیل ہوگئیں۔۱۷۹۰ء میں نئے دستور کی منظوری سے جمہوری جدوجہد کا اہم ترین سنگ میل عبور کرلیا گیا۔(3)

یہ دستور تحریری تھا اور اس کے مطابق جمہوری اساس پر ایک وفاقی نظام حکومت قائم کیا گیا، جس میں قومی اور ریاستی حکومتوں کے دائرہ عمل کی صراحت کردی

(1) See for details: William Andrews, European Political Institutions, p-23-31

(2)&(3) David Held, Models Of Democracy, p-46-52

گئی، قانون کی برتری تسلیم کی گئی اور تقسیم اختیارات کے اصول کے مطابق حکومت کے تینوں شعبوں، مقننہ، عاملہ اور عدلیہ کو علیحدہ کر دیا گیا اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کی بنیاد پر نمائندہ حکومت قائم کی گئی۔(1)

جاگیرداری، بادشاہت اور آمریت کے خلاف مسلسل جدوجہد کے علاوہ انیسویں صدی میں جمہوریت کا کارنامہ زرعی مزدوروں اور عورتوں کی آزادی ہے۔ جاگیرداری اور بادشاہت کے خلاف معاشی اور سماجی آزادی کی جدوجہد تو قرون وسطیٰ سے جاری تھی، مگر انگلستان میں چودھویں اور سترہویں صدی میں اس سلسلہ میں شدید بغاوتیں برپا ہوئیں۔ اسی طرح جرمنی میں۔ انقلاب فرانس اور پھر انیسویں صدی میں کاشتکاروں کی جدوجہد آزادی بارآور ثابت ہوئی جبکہ پولینڈ، آسٹریا اور دیگر یورپی ممالک بھی اس تحریک کی کامیابی کی مثال بنے۔ (2)

خاص طور سے انیسویں صدی کے آخر میں پولینڈ اور روس میں یہ آزادی مثالی کامیابی سے ہمکنار رہوئی۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی غلامی کے انسداد کی صدی ہے۔

امریکہ کی دریافت کے ساتھ ہی جدید غلامی کا ایک نیا دور خود کولمبس ہی کے ہاتھوں شروع ہوا تھا۔ اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا(3) اگرچہ انسانوں کی خرید و فروخت کا یہ کاروبار پندرہویں صدی عیسوی میں افریقی باشندوں کو غلام بنا کر پرتگالیوں نے شروع کیا تھا، جس میں انگریزوں، ہسپانیوں اور فرانسیسی لوگوں کے علاوہ دیگر یورپی قوموں نے بھی حسب توفیق حصہ ڈالا۔ غلاموں کی تجارت میں انگریزوں کا کاروبار دوسری قوموں سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ یہ تجارت سب سے

---

(1) William Andrews, *Ibid*,

(2) John Dunn, Democracy, p-73

(3) David Held, Models Of Democracy, p-46-52

پہلے سرجان ہاکنز نے شروع کی تھی۔ پھر اسپینی نوآبادیوں کو غلام بھیجنے کا کاروبار کرنے کے لیے خاص کمپنیاں قائم کی گئیں۔ ولیم سوم نے عام اجازت دے دی۔ انگریزوں نے ایک معاہدہ کے مطابق اسپینی نوآبادیوں کو سالانہ پانچ ہزار حبشی غلام فراہم کرنے کا ٹھیکہ حاصل کیا اور اس کے لیے ایک کمپنی قائم کی گئی۔ ۱۶۸۰ء سے ۱۷۰۰ء تک صرف بیس سال کے عرصہ میں انگریز تاجروں نے تین لاکھ غلام فروخت کیے اور پچاسی سال کے عرصہ میں ان لوگوں نے صرف جمیکا میں چھ لاکھ سے زیادہ غلام بھیجے۔ غلاموں کی اس تجارت کا سب سے بڑا مرکز لیورپول تھا۔(1)

بہر حال برطانیہ میں اٹھارہویں صدی اور فرانس میں سترہویں صدی کے اختتام پر انسداد غلامی کی تحریک نے جنم لیا، جس کے زیر اثر پورے یورپ میں انیسویں صدی ہی کے دوران غلاموں کی تجارت کو قانوناً ممنوع قرار دے کر روک دیا گیا۔ امریکہ میں اعلان آزادی کے ساتھ ہی غلاموں کو آزاد کرنے کی جدوجہد شروع ہوگئی۔

''۱۸۱۵ء میں ویانا کی کانگریس نے غلامی کے انسداد کے لیے مشترکہ جدوجہد کا تصیفہ کیا۔ اور ۱۸۸۵ء میں عہد نامہ برلن کے مطابق یورپ کی تیرہ اقوام اور امریکہ نے یہ فیصلہ کیا کہ غلاموں کی تجارت اور غلامی کے انسداد کے لیے۔ وہ باہمی تعاون اور مشترکہ کوششیں کریں گے۔''(2)

معاشی حقوق اور آزادی نسواں

جدید جمہوریت کا سب سے اہم کارنامہ سماجی انصاف کے حصول کی جدوجہد ہے جو اپنی اعلیٰ ترین صورت میں جدید دور میں سامنے آئی۔ انفرادی آزادی اور معاشی جمہوریت کا حصول اس کی دو علامتیں بنیں۔ دونوں سمتوں میں جاری اس

(1) See for details: David Held, ***Ibid***, p-47

(2) تفصیل کے لئے دیکھئے: شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت:343

مشکل سفر کے کئی اہم سنگ میل گذشتہ دو صدیوں میں انسان نے کسی حد تک عبور کر لیے ہیں۔تاہم اس سلسلہ میں آئیڈیل کا حصول ابھی باقی ہے۔

انیسویں صدی سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ معاشی انقلابات سے بھی روشناس ہوئی۔ معاشی انصاف کا حصول ہر فرد معاشرہ کا بنیادی حق قرار پایا اور ریاست کا بنیادی فریضہ......معاشی انصاف کی تحریک کا بنیادی محرک صنعتی اور مشینی انقلاب تھا جس نے ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام پیدا کیا اور دوسری طرف انسانی معاشروں کو دو طبقوں، دولتمند اور پرولتاری میں تقسیم کر دیا۔اس پر مستزاد یہ کہ مزدوروں اور بے روزگاروں کے طبقے پیدا ہوئے جو معاشی چکی اور بے رحمی کے آلاؤ میں عذاب کا شکار ہوگئے۔ جمہوری جدوجہد نے بادشاہت کے نظام یا مطلق العنان حاکمیت سے تو نجات دلائی مگر سیاسی میدان میں ایک اور معرکے کو جنم دیا، جو فرد معاشرہ اور ریاست کے درمیان ایک نازک اور گھمبیر کشمکش کی صورت اختیار کر گیا۔اس صورتحال میں سیاسی فکر کے دو دھارے ترتیب پائے جن میں ایک طرف فرد کی انفرادیت، شخصی آزادی اور نجی ملکیت پر روز دیا گیا۔جبکہ دوسری طرف مملکت کی فوقیت و برتری اور استحکام کی وکالت ہونے لگی۔

انفرادی آزادی اور شخصی حقوق پر سب سے زیادہ زور جے۔ایس۔مل (Mill) نے دیا تھا۔جو ایسی جمہوریت کو بھی خطرناک سمجھتا تھا جو انفرادیت پر اثر انداز ہو جبکہ دوسری طرف، جرمن فلاسفر ہیگل، ریاست کو ہی خدا قرار دیتا تھا اور اسی کی پوجا کو حقوق کی ضمانت سمجھتا تھا۔(1)

نظریہ انفرادیت کا ایک منفی نتیجہ، بدترین سرمایہ دارانہ نظام کی صورت میں برآمد ہوا۔آدم سمتھ (Smith) نے معاشیات کے میدان میں حکومتی مداخلت کی مخالفت کی اور مسابقت و مقابلہ کو انفرادی اور قومی معیشت کی بہتری کا بنیادی اصول

(1) تفصیل کے لئے دیکھئے: شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص352

قرار دیا۔نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو فروغ دینے والے سماجی اور معاشی افکار کے ردعمل کے طور پر نظریہ اشتراکیت (Socialism) نے جنم لیا جس کو سائنسی طریق کار پر منظّم کر کے کارل مارکس (Carl Marx) نے پیش کیا۔ مارکس کے مطابق سرمایہ دارنہ معاشرے میں حقیقی جمہوریت محال ہے کیونکہ وسائل پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری ہوتی ہے لہٰذا جمہوری طرز حکومت میں ایسا ہی طبقہ اپنے وسائل کی بنیاد پر حکومت میں آجاتا ہے۔ معاشرے میں سماجی اور معاشی طبقات کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ ہر ایک کو برابر مواقع ملیں۔ سیاسی مساوات کے لیے معاشی اور قانونی مساوات ضروری ہے:۔

Freedom cannot be realzed if freedom means first and foremost the freedom of capital.(1)

(اگر آزادی کا پہلا اور اہم ترین معنیٰ سرمایہ داری کی آزادی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی آزادی کبھی میسر نہیں آئے گی۔)

اس کے خیال میں جمہوری ادارے حکمران اور محکوم کے درمیان غیر ضروری فاصلوں کو جنم دیتے ہیں لہٰذا معاشی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ نمائندہ جمہوریت کی جگہ براہ راست جمہوریت (Direct Democracy) قائم ہو:۔

Marx envisaged the full participation of all free and equal, workers in institution,of direct democracy.(2)

اشتراکی نظریات نے دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی کو متاثر کیا اور معاشی آزادی و مساوات کی تحریک نے جنم لیا۔ دور جدید کے اشتراکی فلسفی ہیرالڈ جے۔ لاسکی (Herald j. Laski:1893-1950) نے آزادی کے تین پہلو بیان کیے ہیں:۔

(۱) انفرادی آزادی Individual Liberty. (۲) سیاسی آزادی Political Liberty.

(۳) معاشی آزادی (3) Economic Liberty.

---

(1) صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی: 331

(2) David Held, Models Of Democracy, p-121 (3) *Ibid*,p-132

جدید جمہوریت کا ایک اور بڑا کارنامہ عورتوں کے لیے سیاسی اور سماجی حقوق کا حصول ہے۔ انیسویں صدی میں یہ تحریک فرانس اور برطانیہ سے شروع ہوئی مگر اس کا فکری رابطہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں تیزی سے نشوونما پانے والے اس سیاسی نظریہ کے ساتھ تھا جس کے مطابق انسان کی انفرادیت، شخصی حقوق اور قانونی مساوات پر زور دیا گیا تھا۔

سترہویں صدی کے انگلستان میں ترقی پانے والے سیاسی نظریات میں سب سے مؤثر کردار (Levellers) کی تحریک کا ہے جس کی قیادت (Lilburne) نے کی۔ انسان کے سیاسی حقوق میں مساوات کا اصول اس تحریک کا روح رواں بنا:۔

Their concern was to insist that economic differences like differences of birth, should not extend to man,s equal right to political liberty.(1)

ایک صدی بعد جان لاک (John Locke) اور تھامس ہابز (Thomas Hobbes) نے بھی اسی بات پر زور دیا، کہ فرد کی آزادی سب سے اہم ہے جس کے تحت اسے اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور وہ ایسی سیاسی حاکمیت کے تحت زندگی گذارے جس کے انتخاب میں اس کی مرضی اور خوشی کا خیال رکھا گیا ہو۔(2)

اس سوچ کو آگے بڑھانے والے بینتھم (Bentham:1748-1832) جیمز مل (J.Mill) اور جان سٹوارٹ مل (J.S.Mill:1804-1873) تھے مگر انہوں نے نظریہ افادی (Utilitarianism) کو بنیاد بنایا۔ ان کے بقول صحیح اور غلط کا معیار فرد کے فائدے اور نقصان پر منحصر ہوتا ہے:۔

The single test of right and the good was the interest of the individual.(3)

---

(1)،(2)Ronald Pennock, Democratic Political Theory, p-125
(3) David Held, Models Of Democracy, p-86

جے۔ایس۔مل۔(J.S.Mill) نے فرد کی شخصی نشوونما میں آزادی افکار و اظہارِ خیال کے حق کو بنیادی اہمیت دی۔وہ انفرادی آزادی کے تحفظ کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا تھا۔لہٰذا اس نے ''انتہائی جمہوریت'' یا اکثریت کے جبر (Tyranny of Majority) کی مخالفت کی، اگرچہ وہ جدید لبرل جمہوریت کا پرجوش مؤید تھا۔
جیسا کہ ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) نے لکھا ہے.

Tohn Stuart Mill was a clear advocate of democracy, preoccupied with the extent of individual liberty in all spheres of human endeavour.(1)

آزادیٔ نسواں کی جدید تحریک جے۔ایس۔مل کی مرہونِ منت ہے، جس نے عورتوں کے حقوق کا چارٹر برطانوی پارلیمنٹ میں تیار کر کے پیش کیا۔اس کے بعد حقوقِ نسواں کی انجمنیں بنیں اور باقاعدہ تحریک شروع ہوئی۔جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں پوری دنیا میں عورتوں کو سیاسی حقوق ملنا شروع ہو گئے۔

For Mill only 'complete equality' between man and woman in all legal, political and social arrangements can create the proper conditions for human freedom and a democratic way of life ... the emancipation of humanity is inconceivable without the emancipaton of woman.(2)

(مل کے نزدیک، مرد و عورت کے درمیان کامل مساوات، جو قانونی، سیاسی اور سماجی نظم میں موجود ہو، انسانی آزادی اور حقیقی جمہوری طرزِ زندگی کی شرائط پوری کرے گی۔انسان کی کامل آزادی، عورت کی آزادی کے بغیر، ناقابلِ تصور ہے۔)

(1) David Held, Models Of Democracy, p-86
(2) *Ibid*,p-99

حاصل مطالعہ

☆ جدید جمہوریت کا ارتقاء یورپ میں پندرہویں اور سولہویں صدی کی نشاہ ثانیہ سے شروع ہوا۔ نشاۃ ثانیہ نے دراصل یورپ میں قدیم یونانی علوم کی ترویج اور اس کے اسلامی تہذیب کے ساتھ (صلیبی جنگوں، تعلیمی اداروں اور کتب کے ذریعے سے) تعارف کی بنیاد پر جنم لیا تھا۔

☆ تحریک اصلاح دراصل بنیادی طور پر مذہبی ادارے کی اصلاح و تعمیر کے لیے شروع ہوئی تھی مگر مذہبی و سیاسی آزادی اور بنیادی حقوق کے شعور کی بنیاد بنی۔ یہی شعور جمہوری ارتقاء کا روح رواں بنا۔

☆ جمہوری فکر نے جمہوری اداروں کی تخلیق و ترتیب میں حصہ لیا اور نشاۃ ثانیہ کے سیاسی مفکرین اسے مزید پروان چڑھاتے رہے۔ اس کا آغاز ایوان رنمائندگان یا نمائندہ حکومتوں سے ہوا۔ یورپی ریاستوں نے اقتدار میں عوام کی شرکت کی یہ صورت نکالی کہ ایسے افراد جنہیں عوام کی تائید حاصل ہوتی ،حاکمیت کے مرتبے پر فائز ہو جاتے ۔ آغاز میں، بادشاہ وقت کی طرف سے عوامی نمائندوں کے انتخاب کی صورت رائج ہوئی جبکہ بعد میں عوام الناس کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دے دیا گیا۔

☆ ازمنہ وسطیٰ سے ہی ایسے حکومتی اداروں کا آغاز ہو گیا مگر حقیقی معنوں میں عوام کی اسمبلیاں، جو اختیار و قوت کی مالک تھیں، صدیوں کے ارتقاء کی بنیاد پر بعد میں معرض وجود میں آئیں۔ تیرہویں صدی کے بعد پارلیمنٹ کو استحکام نصیب ہونا شروع ہوا۔

☆ جمہوری فکر کے ارتقاء اور پذیرائی میں بنیادی کردار میکیاولی، ہابز، جان لاک، مونٹیسکیو، والٹیر اور روسو نے ادا کیا۔ یہ سیاسی مفکرین جدید جمہوریت

کے بانی اور علمبردار ٹھہرے کیونکہ انہوں نے سیاسی آزادی، بنیادی حقوق اور اقتدار میں عوام کی منشاء کے بنیادی تصورات کو بھرپور دلائل کے ساتھ مقبول عام کیا۔ وہ نظام حکومت جو ناپسندیدہ اور ناقابل قبول تھا، اسے پسندیدہ اور قابل قبول صورت میں پیش کیا۔

☆ جدید جمہوریت کے ارتقاء کی بنیاد یہ فلسفہ تھا کہ عوام ایک اجتماعی معاشرتی ضرورت کے تحت، ارادۂ عام کے زیر اثر، ادارہ ریاست کو منظّم کرتے ہیں۔ یہ ارادہ عام ریاست کے وجود اوراس کی ہیئت حاکمہ کی تنظیم کا بنیادی ماخذ ہے۔ یہ حق عوام ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی حکومت کا فیصلہ کریں کہ وہ ان کے لیے بہتر ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے یا بہتر نہیں ہے اور اسے تبدیل کر دینا چاہیے۔

☆ قدیم جمہوریت محدود شہری ریاستوں کی پوری آبادی کی براہ راست شمولیت سے وجود میں آتی تھی۔ یہ طریقہ آبادی کی بڑی ریاستوں میں کارگر نہ ہوسکتا تھا لہٰذا عوام کی بالواسطہ شرکت اقتدار، ایوان نمائندگان یا پارلیمنٹ کی صورت میں ارتقاء پذیر ہوئی۔

☆ جدید جمہوریت کے کارہائے نمایاں میں دستوری جدوجہد کے ذریعے، انسانی آزادی اور فرد کی اہمیت وعظمت کا منوایا جانا، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد کی پر مردوعورت کے حقوق کا تحفظ ہوا، سیاسی و معاشرتی آزادیاں نصیب ہوئیں، معاشی حقوق اور عورتوں کی آزادی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس کا دوررس اثر مغربی دنیا کے انسانوں کے عمومی رویوں پر ہوا۔ یوں جمہوریت ایک طرزِ حکومت سے ایک طرزِ زندگی تک کا سفر کر گئی۔

باب پنجم

جمہوریت کی کامیابی......حقیقت یا سراب!

آج کی جمہوریت

جمہوری طرزِ حکومت کے ارتقاء کو (جیسا کہ گذشتہ صفحات کی تفصیل سے ظاہر ہے) دورِ جدید کی سیاسی وسماجی ترقی کا ایک بیّن ثبوت سمجھا جاتا ہے۔اس وقت جمہوریت کو محض ایک طرزِ حکومت نہیں، بلکہ ایک طرزِ زندگی کے طور پر اپنا لیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ جمہوریت کے ان اصول اقدار کو قرار دیا جاتا ہے جن کے تحت وہ افراد معاشرہ کو آزادی، مساوات اور حقوق انسانی سے فیض یاب کرتی ہیں۔جدید جمہوریت کو عوام کی بالادستی، اکثریت کی مرضی اور انسانیت کی فلاح پر مبنی طرزِ حکومت کی ضمانت مانا گیا ہے۔

جدید ماہر سیاسیات، ایچ۔جے لاسکی (Laski) لکھتا ہے:

Democracy rests on a belief in the fundamenal dignity and importance of the individual , in the essential equality of human beings, and in the need for freedom.(1)

(جمہوریت،فرد کی عظمت اور اہمیت کے بنیادی اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس کا انحصار انسانوں کے درمیان ایک اٹل مساوات اور ان کی آزادی کی شرط پر ہوتا ہے۔)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ جمہوریت کی بنیاد، فرد کی اہمیت وعظمت پر ہے۔اور یہاں افراد معاشرہ کی آزادی ، مساوات اور عوامی طاقت کو جمہوریت کی

(1) An Introduction To Pliltícis, p-48

روح قرار دیا گیا ہے۔ میخائل سیٹورٹ(Michael Stewart) اس فلسفے کی عملی تشریح یوں کرتا ہے:۔

When people claim that their country is a democracy we understand them to say that, as for as is humanly possible, all the adult citizens have an equal opportunity to exercise political power.(1)

(جب کسی ملک کے لوگ ایک جمہوری ریاست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں...... جہاں تک انسانی سطح پر ممکن ہے...... تمام بالغ شہریوں کو یکساں موقع میسر ہے کہ وہ اپنی حاکمیت کا حق استعمال کریں۔)

یعنی اس کے خیال میں تمام شہریوں کو عملاً سیاسی (حق کے استعمال کی) قوت، یکساں اور مساوی طور پر حاصل ہو، تو جمہوریت روبہ عمل ہوگی، ورنہ نہیں۔

عملی سطح پر اس مقصد کے حصول کے لیے جمہوری معاشرے اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق اپنا طرزِ حکومت ترتیب دیتے ہیں۔ قدیم دور سے طرز ہائے حکومت کو، مختلف قسموں میں تقسیم کرنے کے لیے حکمرانوں کی تعداد کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت کو دیکھا جائے تو وہ، ایک فرد یا چند افراد کی جگہ اکثریت کی حکومت کا نام ہے۔ جیسا کہ بابیو (Bobio) کہتا ہے:۔

Democracy is one of three possible governmental forms in the typology which classifies such forms depending on the different numbers of rulers ; more precisely it is that form of government in which power in exercized by all the people , or by the greater part , or by the masses.(2)

یعنی جمہوریت، ان تین ممکنہ طرز ہائے حکومت میں سے، ایک کا اصطلاحی

---

(1) Modern Forms Of Government, p-199

(2) Noberto Bobio, Democracy And Dictatorship,(Tr. Peter Kannealy), p-135

نام ہے، جو حکمرانوں کی مختلف تعداد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز کی جاتی ہیں۔ زیادہ موزوں الفاظ میں یہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں تمام لوگ یا عوام الناس کی بہت بڑی اکثریت اپنا حق حاکمیت استعمال کرتی ہے۔

عوامی اکثریت کی یہ شرکت براہ راست ہو تو وہ طرز حکومت براہ راست جمہوریت Direct Democracy کہلاتا ہے اور اور اگر یہ شرکت بالواسطہ (یعنی منتخب نمائندوں کے ذریعے) ہو تو یہ طرز حکومت بالواسطہ جمہوریت (Representative Democracy) کہلائے گا۔

جمہوریت کی اصل کامیابی کیا ہے؟

آج کی جمہوریت اور اس کے مستقبل کے بارے میں کسی تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ مذکورہ بالا اصول واہداف کو سامنے رکھتے ہوئے، سب سے پہلے اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ آیا جمہوریت کا اپنے اہداف کے حصول میں کامیابی کا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ اس حوالے سے درجِ ذیل سوالات سامنے آتے ہیں (جن کا جواب آئندہ صفحات میں آئے گا):

(i) کیا جمہوریت محض ایک طرز حکومت (کے طور پر کامیاب) ہے یا ایک طرز زندگی (کے طور پر)؟

(ii) کیا جمہوریت کسی مخصوص معاشرے اور خاص ریاست میں کامیاب ہوتی ہے یا یہ زمان ومکان سے ماوراء ایک آفاقی اور عالمگیر اصول ہے؟

جمہوریت کے ارتقائی سفر کی کہانی سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آغاز میں اپنے اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے اور عمل کے میدان میں، یہ محض ایک طرز حکومت (Form Of Government) کا نام تھا۔ قدیم وجدید سیاسی مفکرین نے طرز ہائے

حکومت کی قسم ہی کے طور پر، اس کا ذکر کیا ہے......

حقیقت تو یہ ہے کہ بطور طرز حکومت بھی یہ نظام اسی دور جدید میں ہی مقبول ہوا ہے جبکہ اس سے پہلے ناپسند کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں صرف دو ماہرین سیاسیات کی رائے بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔ جان ڈن (John Dunn) اٹھارویں صدی تک، جمہوریت کی یہ صورتحال بتاتا ہے:۔

Democracy was not yet a faith, not an ideology, not an ethic, it was still a technical term of political science. (1)

(جمہوریت نے اس دور (اٹھارہویں صدی عیسوی) تک ایک عقیدے کی شکل اختیار کی تھی نہ ایک نظریۂ زندگی اور اخلاقی اصول کی...... بلکہ یہ سیاسیات کی محض ایک فنی اصطلاح تھی۔)

اسی طرح پال ای کارکورن (Paul E .Corcoran) کی رائے کا، گراہم ڈنکن نے حوالہ دیا ہے:

From the perspective of twenty five hundred years of western political thinking, almost no one, untill recently, thought democracy to be a very good way of structuring political life.(2)

(مغربی سیاسی سوچ کو، گذشتہ پچیس سو سال کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی قریب تک کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے جمہوریت کو، سیاسی زندگی کی تشکیل کا کوئی بہت بہتر نظام سمجھا ہو!)

البتہ جہاں تک جدید دور میں اسکے لغوی معنوں اور وسیع ہوتے ہوئے مفہوم کا تعلق ہے تو یہ بات صحیح ہے کہ ماضی قریب سے، اسے قبول عام کی سند حاصل ہے:

Democracy is the world's new universal religion.(3)

---

(1) Democracy، p-59,

(2),(3) Graem Duncan,Democratic Theory And Practice, p-13

لیکن یاد رہے کہ جب ہم اسے ایک طرز زندگی (Life Style) کہتے ہیں تو اس سے مراد زندگی کا ایک عمومی رویہ ہوتا ہے، نا کہ کوئی مکمل ضابطہ حیات (A Complete Code of Life) جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں انگریزی زبان کے لفظ (Religion سے مغالطہ ہوتا ہے۔ جمہوریت علامتی طور پر Symbolically ایک Religion کہلا سکتی ہے، حقیقی معنوں میں نہیں۔ ہاں البتہ اگر مذہب یا Religion کو ایک نجی معاملہ (Private Affair) کے طور سے دیکھا جائے تو جمہوریت چونکہ انفرادی حقوق، آزادی اور مساوات کی اقدار سے مزین ہے، اس لیے مغرب کے معاشروں میں جمہوریت ایک رویہ اور اسلوبِ زندگی بن چکی ہے۔

گذشتہ دو صدیوں میں وقوع پذیر ہونے والے عالمی واقعات اور انسانی رویوں میں درآنے والی ''جمہوری'' تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمہوریت کے اثرات دور جدید میں، انسان کے فکر و فلسفہ (Ideology) اور تہذیب و تمدن (Culture & Civilization) دونوں پہلوؤں پر ہوئے ہیں۔ ان کی ایک سطح انفرادی زندگی (Individual Life) اور دوسری سطح اجتماعی زندگی (Social Life) کی ہے۔ لیکن افسوس کہ ان اثرات کی ایک سطح خوشنما اور مفید ہے، جبکہ دوسری بھیانک اور ضرر رساں ہے۔

انفرادی آزادی و خود مختاری نے مذہبی و معاشی آزادی (Liberalism) سے بالخصوص مغربی انسان کو روشناس کیا۔ مگر یہ آزادی ایک طرزِ زندگی کے طور پر ارتقاء پذیر ہو کر جدید لادینیت (Secularism) کی صورت میں مقبول عام ہوگئی، جس کا ناقابل تلافی نقصان یہ ہوا ہے کہ انسانی معاشروں میں مذہب و اخلاق کی برتری ختم ہوگئی ہے۔

اجتماعی حق اقتدار نے پہلے قومیت پرستی کو فروغ دیا پھر احساسِ برتری کے ساتھ نئے فاشزم (Fascism) اور نو آبادکاری کے توسیع پسندانہ رجحان (Colonial

Expansion) کی صورت میں دنیا پر چھا گیا۔

نیشنلزم اور فاشزم نے دنیا کا جغرافیہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ایک طرف تو قوموں کی قومیں غلام بنالی گئیں اور دوسری طرف بیسویں صدی کے پہلے ہی نصف میں دو عظیم جنگوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کو موت اور ذلت کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔ کیا اس سب کچھ کو ہم جمہوریت کی ''کامیابی'' کہہ سکیں گے؟......

جمہوریت کتنی ''جمہوری'' ہے؟

اب اس تصور اور فلسفے پر غور کیجئے جسے جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ 'جمہوریت کا دوسرا نام Rule of People یعنی عوام کی حاکمیت ہے۔

یہ فلسفہ (اگر اسے فلسفہ کہا جا سکے تو) ایک طرف تو فکری و نظری اعتبار سے کئی حوالوں سے نامکمل اور محل نظر ہے اور دوسری طرف تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس تصور کے عملی صورت میں ڈھلنے تک، اس میں کئی انحراف (Deviations) واقع ہو چکے ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دو الفاظ **Rule** اور **People** کے مفاہیم کی تعیین میں الجھاؤ اور پیچیدگی در آتی ہے یعنی یہ کہ لفظ Rule کے تحت اقتدار اور حاکمیت کی نوعیت اور حدود و آداب کیا ہوں اور لفظ People کے تحت ''عوام'' سے مراد کون ہے؟

(1) حکومت میں عملاً چند لوگ ہو سکتے ہیں جبکہ عوام سے مراد اکثریت ہے، جس کا حکومت کرنا عملاً محال ہے۔ پھر یہ کہ حکومت کرنے کے لیے جس دانائی، بصیرت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ اکثریت کی بجائے اقلیت میں پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے بھی عوام الناس کا حکومت کرنا ناممکن العمل ٹھہرتا ہے۔

(2) لوگ یعنی People ایسا لفظ ہے جو بظاہر ایک ''کل'' کی نمائندگی کرتا ہے

اور اجتماعیت کا مفہوم رکھتا ہے مگر اس کے اجزاء یعنی افراد، ذہنی و جسمانی استعداد کے لحاظ سے، معاشی و سماجی مقام کے حوالے سے، پسند و ناپسند اور ترجیحات کے اعتبار سے، نہ صرف باہم مختلف بلکہ باہم متضاد ہوتے ہیں۔ لہٰذا صلاحیت، مواقع اور ترجیحات کے فقدان کی بنیاد پر ان کا کسی ایسے فیصلے پر پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے جو سب کے لیے یکساں طور پر مفید، موزوں اور قابل قبول ہو۔

(3) ''لوگوں کی حکومت'' میں اکثریت کے اصول (Majority Principle) کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یعنی جس چیز کو زیادہ افراد قبول کریں، قانون بن جائے گی جبکہ ایک ایسا فیصلہ، جس کی حمایت اقلیت کر رہی ہو اور وہ خواہ کتنی ہی معقولیت پر مبنی ہو، رد کر دیا جائے گا۔ اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے عمومی فیصلوں میں، معقولیت و منطقیت کی بجائے خواہشات و جذبات کو بنیاد بناتی ہے۔ لہٰذا اکثریت کے اصول کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیصلے غلط ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اقلیت، اکثریت کے جبر میں آجاتی ہے۔ اگر یہ جمہوریت ہے تو اس کو عوام کی حاکمیت نہیں اکثریت کی حاکمیت (Majority Rule) کہنا ہوگا۔(1)

(4) اس پر مستزاد یہ کہ معیار یہ نہیں رہتا کہ ''کون (اور کیا)'' رائے دے رہا ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ''کتنے (اور جیسی بھی)'' رائے دے رہے ہیں۔ اس طرح سارے کا سارا معاملہ (Quality) یا معیار کی بجائے (Quantity) یا مقدار اور تعداد پہ چلا جاتا ہے۔

(5) تاہم اکثریت کا اصول عقلی دلائل کے لحاظ (Logical Basis) یا اخلاقی بنیادوں (Moral Grounds) سے درست نہ بھی ہو تو کسی فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچنے میں، یہی طریقہ کار اپنانا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ایسے معاملے میں جہاں لوگوں کی مرضی ہی کو بنیاد بننا ہو! ایک معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ

---

(1) Jack Lively, Democracy, p-9

(i) لوگوں یا عوام الناس میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ریاستی وحکومتی فیصلوں یا معاملات میں مداخلت سے دلچسپی نہیں رکھتے، اس لئے کہ اس کا انہیں شعور نہیں ہوتا۔

(ii) بہت سوں کا ان فیصلوں سے سروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ کچھ لوگوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا کہ وہ سیاست وحکومت کے کاموں سے وابستہ ہوں۔

(iii) بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شعور اور دلچسپی رکھنے کے باوجود مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں ایسے معاملات میں صحیح طور پر شرکت کرنے کے مواقع اور وسائل میسر نہیں ہوتے۔

لہٰذا ایک تو اکثریت کے اصول کے نفاذ میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دوسرا ایسی صورتحال میں جمع ہونے والی رائے کو حقیقی اکثریت کی رائے یا اکثریت کی حقیقی رائے کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گویا طریق کار خود، روح جمہوریت کو کچل کے رکھ دیتا ہے:۔

The very means by which socialist and democratic parties endeavour to create a democratic society is the procedure through which it must necessaily be lost.(1)

(جن ذرائع کی مدد سے اشتراکی اور جمہوری پارٹیاں، ایک جمہوری معاشرہ بنانے کی کوشش کرتی ہیں، وہی طریقہ کار دراصل، حقیقی جمہوریت کو لازمی طور پر کھو بیٹھتا ہے۔)

(6) مزید برآں اس میں ظلم یہ ہوتا ہے کہ ایک سیاسی دانشور یا ماہر دستور وقانون کی رائے کو، جو ریاستی وحکومتی معاملات سے زیادہ متعلق، موزوں اور مفید ہو سکتی ہے 'ایک ان پڑھ کسان کی رائے کے برابر گنا جاتا ہے جو بعض اوقات اس کے شعور یا اس کی دلچسپی کے لحاظ سے اور بعض اوقات اس کے غیر متعلق اور غیر موزوں ہونے کے

(1) David Held, Models Of Democracy, p-122

لحاظ سے بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر سیاسی ماہرین یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ جمہوری نظریہ، خود جمہوری عمل اور طریقہ کار کی کوتاہیوں کی نذر ہو جاتا ہے:

Democratic Practice throws a dark light on democratic theory.(1)

(7) اکثریت کے اصول کا یہ پہلو بھی تجزیہ طلب ہے کہ آیا جمہوری طریقے سے حاصل ہونے والی رائے، واقعتاً اکثریت کی رائے ہوتی ہے یا نہیں؟...... اس کا جواب ہاں میں نہیں دیا جا سکتا۔

(i) جمہوری نظام حکومت کو عمل میں لانے کے لیے انتخاب (Election) کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اس طریق کار کی پیچیدگیوں اور خامیوں سے قطع نظر...... الیکشن میں رائے دینے کا حق دار صرف رجسٹرڈ ووٹر (Voter) ہو سکتا ہے، غیر رجسٹرڈ نہیں۔ اس طرح آبادی کا ایک حصہ جو "عوام" میں شامل ہے، مگر جمہوری عمل سے باہر رہتا ہے۔

(ii) بطور ووٹر رجسٹرڈ ہونے کی شرط بلوغت (یا خاص حد عمر) ہے۔ جس کا مطلب ہے عوام الناس میں سے خاص عمر کے افراد اس عمل میں حصہ لیتے ہیں۔

(iii) پھر جب ووٹ ڈالے جاتے ہیں تو سارے رجسٹرڈ ووٹرز، ووٹ نہیں ڈالتے، بہت سارے لوگ الگ رہ جاتے ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا "عوام" کی اکثریت جمہوری عمل میں حصہ لیتی یا............اقلیت شامل ہوتی ہے اور اکثریت دور رہتی ہے؟

گویا اشتراکی مفکرین کا یہ اعتراض صحیح ثابت ہو جاتا ہے کہ:۔

Liberal political dectrines effectively restrict freedom to a minority of the population.(2)

---

(1) Graem Duncan, Democratic Theory And Practice, p-13

(2) Noberto Bobio, The Future Of Democracy, p-16

(آزاد منشی کا سیاسی اصول، مؤثر طریقے سے، آزادی کو آبادی کی ایک اقلیت تک محدود کر دیتا ہے۔)

(8) مزید یہ کہ خود ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ پہلو ایسے سامنے آتے ہیں کہ اکثریت کا خواب پورا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر:

(i) اگر امیدوار دو ہوں اور ان کا فرق ۵۱ اور ۴۹ فیصد کا ہو تو کیا ۵۱ فیصد کو (یعنی صرف ایک کے فرق سے اور وہ بھی درج بالا تشنۂ تکمیل طریق کار کے تحت) اکثریت کہا جائے گا؟......

(ii) اگر امیدوار دو سے زیادہ ہوں (مثلاً چار) تو بہت دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ۱۰۰ میں سے تیس ووٹ لینے والا ''اکثریت'' کا نمائندہ منتخب ہو جاتا ہے جبکہ اس کے خلاف (تین) مختلف امیدواروں کے حق میں ڈالے گئے (فرض کیا 26، 24، 20) ۷۰ ووٹ ''اقلیت'' قرار پاتے ہیں۔

کیا حقیقی جمہوریت ممکن ہے؟......

درج بالا تجزیئے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ عوام کی حکومت کا تصور اور اکثریت کے اصول کا عمل میں آنا بہت حد تک ناممکن ہے۔ اس بنیاد پر نوبرٹو بابیو (Noberto Bobio) یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ:۔

No true democracy has ever existed nor ever will.(1)

(حقیقی جمہوریت کبھی معرض وجود میں نہیں آئی اور نہ ہی مستقبل میں کبھی آئے گی۔)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری نظام کے پنپنے کے لیے کچھ خاص پس منظر اور

(1) Democracy And Dictatorship, p-149

ماحول درکار ہے جس کی عدم موجودگی میں جمہوری طرز حکومت، ثمر بار نہیں ہوسکتا۔ گویا جمہوریت کوئی ایسا آفاقی اصول اور عالمگیر صداقت نہیں جو ہر جگہ پر درست پایا جائے بلکہ ایک خاص طرح کے حالات اور خام مال کے ذریعے معرض وجود میں آتی ہے اور اسی خاص طرح کے ذرائع سے زندہ رہتی ہے۔

(1) حقیقی جمہوریت کی سب سے پہلی ضرورت ایک ایسی ریاست ہے جو محدود آبادی کی حامل ہو۔ قدیم یونانی آبادیوں میں ایسی ریاستیں ہی جمہوریت کے لیے مثالی قرار پاتی تھیں ۔ جہاں سارے شہری ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہوکر اپنے اجتماعی معاملات کا فیصلہ، بحث وتمحیص کے بعد کرسکتے تھے۔ یہ الگ بات کہ شہری کی تعریف میں ایک محدود اقلیت ہی شامل ہوتی تھی بلکہ بچے، غلام اور نصف آبادی یعنی خواتین اس پورے عمل سے الگ رکھے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حقیقی جمہوریت کے لئے یونانی ریاستوں کو مثالی قرار دینا تاریخی طور پر غلط ہوگا تاہم انہیں ابتدائی تجربہ گاہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ایسی تجربہ گاہیں دنیا کے کئی ایک علاقوں میں اس دور میں موجود تھیں۔

دور جدید کی بڑی ریاستیں جہاں ایک ایک شہر، یونان کی ریاستوں سے کہیں زیادہ آبادی رکھتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ اصل جمہوریت راہ پاسکے۔ بابیو (Bobio) کے بقول، روسو (Rosseau) نے اسی بنیاد پر حقیقی جمہوریت کے وجود سے انکار کیا ہے اور اس کے لیے ایک چھوٹی ریاست کو ضروری قرار دیا ہے:۔

Even Rosseeu was convinced that a real democracy has never existed because it required, among other conditions, the existence of a small state, in which every citizen could easily get to know all the others.(1)

(2) گویا دور جدید میں اس سہولت کی عدم دستیابی کی بنیاد پر نمائندہ جمہوریت

(1) Noberto Bobio, The Future Of Democracy, p-130

اپنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ جدید دنیا میں اس کی کئی صورتیں تخلیق کی گئی ہیں مگر اس سلسلہ میں بہت سے سوال بے جواب رہتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ کیا وہ جمہوری خودمختاری ...... جو آزاد معاشروں میں براہ راست جمہوریت میں شریک ہونے والے ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے ...... قابل انتقال ہے یا نہیں؟ آیا کوئی ایک فرد دوسرے کی نمائندگی ذہن و دل اور مافی الضمیر کے لحاظ سے کرسکتا ہے؟ ...... قدرتی بات ہے کہ یہ ناممکن نظر آتا ہے جیسا کہ روسو (Rosseau) کا قول نوبرٹو بابیو (Noberto Bobio) نے نقل کیا ہے کہ:

Sovereignty can not be represented.(1)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید کی نمائندہ جمہوریت، دراصل بنیادی جمہوری فکر اور فلسفے سے انحراف کے مترادف ہے، جیسا کہ ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) لکھتا ہے:

....a shameful and mistaken deviation from the original idea of government by the people, for the people and through the people.(2)

(موجودہ جمہوری طرز حکومت دراصل غلط فہمی پر مبنی ایک شرمناک انحراف ہے، اس نظریہ سے کہ (جو جمہوریت کی بنیاد ہے) یعنی: لوگوں کے ذریعے...... لوگوں کی خاطر...... لوگوں کی حکومت۔)

(3) مزید برآں یہ کہ اس کے نتیجے میں جو ادارے معرض وجود میں آتے ہیں وہ جمہوریت کی راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ کارل مارکس نے واضح کیا تھا:

Parliaments create inacceptable barriers between the ruled and their representatives.(3)

---

(1) Noberto Bobio, Democracy And Dictatorship, p-152

(2) David Held, Models of Democracy, p-130

(3) Jack Lively, Democracy, p-62

(پارلیمان (کے ایوان)، رعایا اور ان کے منتخب نمائندوں کے درمیان، ناقابل قبول، رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔)

(4) نمائندہ جمہوریت (Representative Democracy) قائم کرنے کا سب سے بڑا اور بنیادی، واحد ادارہ انتخابات ہیں۔ یہ خود حقیقی جمہوری حکومت کے قیام میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ موجودہ الیکشن کے نظام میں دولت مند طبقے کے علاوہ کوئی عام آدمی منتخب نہیں ہو سکتا...... بلکہ حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جبکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ معاشرے میں دولت مند افراد اقلیت میں ہوتے ہیں اور عوام الناس (غرباء) اکثریت میں۔ آج کے دور میں انتخابات ایک صنعت بن چکے ہیں۔ امیدواروں کے حق میں رائے بنانے والی کمپنیاں اور ادارے بھاری رقوم لے کر ان کے تشخص اور تأثر (Image and Impact) بناتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ عام آدمی کے بس کا کھیل نہیں۔

ایسی صورتحال میں منتخب ہونے والے ممبران ایک ایسا ادارہ اور سیاسی طبقہ وجود میں لاتے ہیں جو عوام کا نہیں خواص کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ نمائندے، اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں صرف سرمایہ داروں کو قوت و حاکمیت حاصل ہوتی ہے اور جمہوریت ان کی اس فوقیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح عوام الناس محروم طبقے میں تبدیل ہو کے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا بقول برنکن (Burnkein) کے، مارکس (Marx) کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوتا ہے کہ:

Democracy is the outcome of bourgeois capitalist society and emerges as a product of the more or less violent over throw of feudal forms of property ownership and of aristocratic political regimes.(1)

(1) John Burnkein, Is Democracy Possible?, p-156

(جمہوریت، دراصل ایک سرمایہ دارانہ بورژوائی معاشرہ کی پیداوار ہے۔ جس نے، جائیداد کی ملکیت کے، جاگیرداری نظام اور اشرافیہ کی سیاسی حاکمیت کے، پرانے نظام کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔)

(5) پسماندہ ممالک میں ان پڑھ عوام کے لیے یہ طرز حکومت سیاسی لحاظ سے ناممکن العمل اور سماجی الجھنوں کا گورکھ دھندا بن کے رہ گیا ہے کیونکہ سیاسی نظام کے عملی اظہار کے لیے تعلیم و شعور بنیادی ضرورت ہے۔ پھر نمائندگی کرنے والوں اور نمائندوں کو منتخب کرنے والوں کے لئے چونکہ کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں ہوتا، لہٰذا جمہوریت ایک جاہلوں کی حکومت (Government of the ignorant people) بن کے رہ جاتی ہے۔ جہالت عام ہونے اور سیاسی مہارت نہ ہونے کی بنیاد پر ایسی حکومت اور عوام دونوں...... پیشہ ورانہ مہارت اور منظّم نوکر شاہی کے غلبہ میں آ جاتے ہیں۔

(6) حکومت کا ایک اہم فریضہ اور کردار معاشرے میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنا ہوتا ہے جبکہ انتخابی جمہوریت میں پارٹی سسٹم کی وجہ سے معاشرے میں مختلف طبقات کے مفادات کا باہمی ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے، نااتفاقی اور طبقاتی سبقت کا رجحان بڑھنے لگتا ہے۔ افراد معاشرہ کے درمیان اس غیر اعلان شدہ کشمکش (Undeclared Conflict) پیدا کرنے کی بنیاد پر جمہوریت پورے تمدن کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر قدیم سیاسی مفکرین تھیوسی ڈائیڈز (Thucydides) افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) اس طرز حکومت کی مخالفت، نظریاتی اور عملی، دونوں پہلوؤں سے کرتے رہے۔ گراہم ڈنکن (Duncan) کے بقول وہ لوگ ایتھنز کی جمہوریت کو فکر و عمل، دونوں کے لحاظ سے ایسا سمجھتے تھے کہ یہ طرزِ حکومت، امن و جنگ کے حوالے سے منتقم مزاج اور غیر شائستہ ہے......اور داخلی معاملات کے لحاظ سے غیر مستحکم اور ادنیٰ درجہ کے رویہ کا حامل بھی!

They found Athenian democracy, both in theory and in practice, to be vengeful, impolite in war and peace, unstable and mean spirited in its internal affairs.(1)

انہی بنیادوں پر آج کا سیاسی مفکر، اسے تشنۂ تکمیل سمجھتا ہے:۔

Democracy is a rare and desireable political form, vulnerable in theory and practice and always incomplete in certain respects. (2)

(جمہوریت ایک پسندیدہ مگر نایاب طرزِ حکومت ہے۔ یہ اپنی فکر اور عملی طریقۂ کار کے لحاظ سے کمزور و عاجز ہے۔ اور ہمیشہ کئی پہلوؤں سے نامکمل رہتی ہے۔)

(7) جمہوریت کا یہ ادھوراپن، ایسا مستقل نقص ہے جو اس کی بنیادوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ مقاصد جو بذریعہ جمہوریت حاصل ہونے ہوتے ہیں وہ دراصل خود جمہوریت کے ارتقاء کے لیے، بطور خام مال، درکار ہوتے ہیں۔

(i) مثال کے طور پر جمہوریت ایسے معاشرے میں نہیں پنپ سکتی، جہاں تعلیم نہ ہو۔ دوسری طرف تعلیم عام ہونے کی بنیاد حصول تعلیم کے ایسے مواقع ہیں جو عوام الناس کو یکساں طور پر آسانی سے حاصل ہوں۔ یہ خود ایک جمہوری معاشرے کے ذریعے ممکن ہے یعنی ایک طرف تعلیم ذریعہ ہے معاشرے کو جمہوریت کی راہ پر لانے کا اور دوسری طرف تعلیم عام ہونا (ہر ایک کے حق کے طور پر) نتیجہ ہے مستحکم جمہوریت کا۔

ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) لکھتا ہے:۔

Direct democracy requires relative equality of all participants, a key condition of which is minimal economic and social differentiation.(3)

(ii) (براہِ راست (مطلق) جمہوریت کا تقاضا ہے کہ اس میں شریک سارے لوگوں میں قابل ذکر حد تک مساوات موجود ہو، ایک کلیدی شرط کے طور پر معاشی اور

(1) Democratic Theory And Practice, p-13 (2) *Ibid*, p-3

(3) David Held, Models of Democracy, p-158

سماجی تفاوت کم سے کم ہو۔)

(iii) اسی طرح جان برنکن (John Brunkein) جمہوریت کی آبیاری کے لیے ضروری شرط یہ بیان کرتا ہے کہ معاشرے کو پہلے اپنے سماجی رویوں میں جمہوری ہونا چاہیے:

The society should be reasonably democratic in its social attitudes.(1)

(معاشرے کو اپنے سماجی رویوں کے اعتبار سے معقول حد تک جمہوری ہونا چاہئے۔)

اگر کسی معاشرے میں جمہوریت پیدا کرنے کے لیے کسی حد تک جمہوریت کا پہلے ہونا ضروری ہے تو پھر جمہوری طرزِ حکومت کا فائدہ اور ضرورت کیا رہ جاتی ہے؟......

یہاں یہ الجھاؤ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا جمہوریت ایک ذریعہ ہے یا خود منزل؟

اس سلسلہ میں ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) کی رائے قابل توجہ ہے، وہ لکھتا ہے:

Democracy is about means not ends ... nothing more than a kind of politics of procedure in which interests are advanced according to some plans of war or by a more or less orderly competition. (2)

(جمہوریت مقصد نہیں، ذرائع سے سروکار رکھتی ہے۔ یہ ایک سیاسی عمل کی ترکیب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کے تحت مفادات کا ارتقاء ہوتا ہے، کسی منصوبہ جنگ کے حوالے سے، یا پھر کسی متردد مقابلے کی فضاء میں۔)

(8) گویا یہ ایک ایسا راستہ اور ذریعہ ثابت ہوا جس کی اصل منزل جمہوری معاشرہ نہ تھی اور اس نے ایسی منزل پر پہنچا دیا، جو دراصل چاہی نہیں گئی تھی۔ لہٰذا عملی

---

(1) Is Democracy Possible? p-156

(2) David Held, Models of Democracy, p-158

میدان میں ایک خاص طبقہ کی آزادیوں کو تحفظ اور خواہشات کو تکمیل کا تحفہ عطا کرنے میں، یہ میکنزم کسی حد تک کامیاب رہا ہے اور جمہوریت کے وہ اصل مقاصد جن کا تعین، اسکوتر و تج دیتے وقت ہوا تھا یا وہ توقعات جو اسے پھیلانے اور عام کرنے کا باعث بن رہی تھیں، ابھی ایک ادھورا خواب ہیں۔

(9) جمہوریت نے معاشروں میں انفرادی خواہشات کی حوصلہ افزائی کو ایک قانونی شکل دی ہے، جس سے افراد معاشرہ میں حرص و ہوس کی مسابقت نے جنم لیا ہے۔ اجتماعی مفاد پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس طبقاتی مسابقت میں غریب اور کمزور پس کے رہ گیا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھا جائے تو اشتراکی مفکرین کی یہ بات حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ:۔

Democracy is like the 'market place',an institutional mechanism to weed out the weakest and establish those who are most competent in the competitive struggle for votes and power.(2)

(جمہوریت ایک 'عوامی منڈی' ہے۔ ایک اداراتی طریقۂ کار، جس کے تحت کمزوروں کو نیست و نابود کیا جاتا ہے اور ایسے 'موزوں ترین فریق' کو مستحکم کیا جاتا ہے جو ووٹ (عددی قوت) اور (سیاسی) طاقت کے ساتھ، اس تقابلی معرکہ میں آگے بڑھ سکے۔)

(10) اس تجزیے سے یہ اہم بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جن مقاصد اور آئیڈیلز کو سامنے رکھ کے جدید جمہوریت کو فروغ دیا گیا تھا، دراصل وہ ایسے میکنزم کا منطقی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا یہ ان مقاصد کے حصول کا موزوں ذریعہ ہی ثابت نہیں ہوئی۔ ڈیماکریسی جو کچھ پیدا کرسکتی تھی وہ کر چکی اور جو کچھ اس کے ذریعے حاصل ہوا ہے وہ ان آئیڈیلز کے ساتھ میل نہیں کھاتا جو عوام کی حکومت کے دلکش نعرے میں مضمر تھے۔

---

(2) Graem Duncan, Democractic Theory And Practice, p-13

اس حوالے سے رابرٹ ڈاہل(Robert Dahl) کا تجزیہ حقیقت کی عکاسی یوں کرتا ہے:

Democratic thought is not a proper vehicle for metaphysical or systematic social theory.... What is more certain historically, such theory is not the vehicle for democratic thought. (1)

(دراصل جمہوری فکر کوئی موزوں ذریعہ ہی نہیں، کسی غیر مادی یا اعلیٰ سماجی فکر کو پروان چڑھانے کا...... بلکہ تاریخی لحاظ سے جو بات یقینی طور پر صحیح ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ (طرزِ سیاست وحاکمیت) خود جمہوری فکر کے لئے بھی موزوں ذریعہ نہیں ہے۔)

لہٰذاانسانی معاشروں کی طرف سے وہ تائید جو جمہوریت کو (Popular) کرتے وقت کی گئی تھی وہ بقول ڈال(Dahl) کے ایک فکری مغالطہ سے کم نہ تھی:۔

.....a vague endorsement of a popular idea.(2)

(ایک مبہم تائیدایسے خیال کی، جومشہور ہوگیا ہے۔)

اس پرستم یہ ہے کہ آج مشرق ومغرب میں جمہوریت کوایک مقدس گائے (Sacrosanct) کا درجہ دے دیا گیا ہے۔اس کی خامیاں تلاش کرنا غیر ضروری اور ناجائز سمجھا جاتا ہے اوراس کی خوبیوں کے بارے میں سوال کرنے کو'غیر جمہوری رویہ' گردانا جاتا ہے۔اس بات کو اینڈریو ہے وُڈ(Andrew Heywood) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

So broad is respect for democracy that it has come to be taken for granted, its virtues are seldom questioned and its vices rarely exposed.(3)

---

(1) Robert Dahl, Democracy And Its Critics, p-6 (2) *Ibid*
(3) Andrew Heywood, Politcal Ideas And Concepts, p-171

جمہوریت کی اس دلکشی اور پسندیدگی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ تأثر قائم کرنے میں کامیاب ٹھہری ہے کہ اس نے ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقے کی حکومت میں، عوام الناس کی قابل ذکر تعداد کو بھی کسی حد تک شامل کرلیا ہے:۔

The attraction of liberal democarcy is its capacity to blend elite rule with a significant measure of popular participation.(1)

گویا جمہوریت کے ہوتے ہوئے عوام الناس اس حقیقی مغالطے میں رضاکارانہ گرفتار رہتے ہیں کہ وہ بھی حکومت میں شامل ہیں۔ اور جمہوری میکنزم کی غلام گردشوں میں سے گذرتے ہوئے، اس سراب کا تعاقب کرتے رہتے ہیں کہ آزادی کی نیلم پری ان کے قبضے میں اب آئی کہ اب!

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو اسے سمجھا ہے آزادی کی اک نیلم پری!

(2)

---

(1) Political Ideas And Concepts, p-171

(2) علامہ اقبالؒ، بانگ درا، کلیات (اردو): 201

جمہوریت کا مستقبل......مشکلات اور امکانات

سیاسی مفکرین کا کہنا ہے کہ حقیقی جمہوریت کا دنیا میں کسی جگہ وجود نہیں ہے۔ جان برنکین(John Brunkein) کی کتاب Is Democracy Possible? کا پہلا جملہ یہی یہ ہے۔

اس وقت جمہوریت کے نام سے دنیا میں جو چیز موجود ہے وہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام حکومت کا وہ پارلیمانی طرز حاکمیت ہے جو لبرل ڈیما کریسی کے نام سے ایک نمائندہ جمہوریت کی صورت میں رائج ہے۔ 1981-90 کی دہائی میں کئے جانے والے ایک سروے نے ثابت کیا ہے کہ یہ یورپ کا مقبول ترین طرز حکومت ہے:۔

A survey of eleven European countries covering the period of 1981-90 also showed that over 90 percent approved of the democratic system of government.(1)

اس کی وجہ بقول اینتھونی گڈنز (Anthony Giddens) یہ ہے کہ لبرل ڈیما کریسی اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے:

Liberal Democracy and capitalism are bound to one another because economic development enhances the conditions of individual autonomy.(2)

گویا آزاد جمہوریت اور سرمایہ داری، ایک دوسرے کے ساتھ اسلئے جڑے ہوئے ہیں کہ معاشی ترقی دراصل فرد کی خودمختاری کے لئے زیادہ سازگار ماحول مہیا کرتی ہے۔ فرد کی انفرادی آزادی اور خودمختاری ہی جمہوریت کا طرۂ امتیاز ہے جو اسے ماضی سے حال تک لے آیا ہے اور حال سے مستقبل کی طرف لے جاسکتا

(1) Anthony Giddens, The Third Way, p-72

(2) Beyond Left And Right, p-107

ہے۔یہی وہ خصوصیت اور کارنامہ ہے جس کی بنیاد پر ہے وڈ(Heywood) کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی، عالمگیر سطح پر لبرلزم کے عروج کی صدی تھی اور نئی صدی میں جمہوری نظام کا بول بالا رہے گا اور اس کے خیال میں یہ بنیادی طور پر لبرلزم ہی کا تحفہ ہے:

The liberal model of representative government conbined with market based economics that has dominated political and social development in the West since the nineteenth century, is spreading remorselessly, throughout the globe.(1)

(نمائندہ حکومت کی وہ شکل جو آزاد خیالی کے تصور پر بنتی ہے اور جو......آزاد معیشت کے اصول سے وابستہ ہو کر مغربی ممالک کی سیاسی اور سماجی ترقی پر، انیسویں صدی سے حاوی ہو چکی ہے......عالمی سطح پر بھی بے دھڑک بڑھتی جارہی ہے۔)

مگر وہ مختلف سیاسی مفکرین کی آراء کی روشنی میں لکھتا ہے کہ لبرلزم نئے دور میں کئی طرح کی اندرونی اور بیرونی مشکلات کا شکار ہوگا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لبرلزم، عمومی بھلائی کو وسیع پیمانے پر پھیلانے میں ناکام رہا ہے۔یہ انفرادی جدوجہد، معاشی مسابقت، بےقید آزادی اور اخلاقی خلا سے پر ہے۔جس سے عملی سطح پر افراد معاشرہ میں اتفاق وتعاون کے بجائے انتشار وافتراق پنپ رہا ہے۔معاشرے کے لئے اجتماعی سوچ اپنانے اور اپنے حصے کی سماجی اور اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کی بجائے انفرادی سطح کی سوچ اور خودغرضی پر مبنی، مفاد پرستانہ رجحانات جنم لے رہے ہیں:

Therefore, in the long run, liberal society may lack the cultural resources either to check un-restrained egoism or to promote coopration and collective endeavour.(2)

(لہٰذا آخرکار، یہ آزادمنشی پر قائم معاشرہ، ایسے ثقافتی ذرائع سے محروم ہو سکتا ہے جو بے مہار قسم کی خود پرستی کو روک سکتے ہیں اور افراد معاشرہ میں سماجی تعاون یا اجتماعی کاوش کے جذبوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔)

---

(1) Heywood, Political Ideologies, p-62 (2)*Ibid*, p-63

لبرل سوسائٹی کا یہ ایک، نا قابل علاج متعدی مرض ہے، جو اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ ایسے معاشرے اپنی قوت مدافعت سے محروم ہو رہے ہیں اور اس بنیاد پر باہر سے حملے آسان ہو سکتے ہیں۔ ایسا کوئی بھی نظریہ زندگی اور نظام تمدن جو انسانوں کو ایک مقصد و منزل کی طرف یکسو کر دے۔ باہمی تعاون، اتحاد اور یکجہتی کی لڑی میں پرودے اور اپنی ذات سے آگے ایک آفاقی اور عالمگیر سوچ سے وابستہ کر دے، لبرلزم کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہوگا۔

بیرونی خطرات میں لبرلزم کے لیے ایک چیلنج مشرقی یورپ کی جنوں خیز قومیت پرستی ہے جو آغاز میں جمہوریت کے نام پر تقویت پاتی ہے اور آخر کار فاشزم کو گلے لگا لیا کرتی ہے۔ جمہوریت کے نام پر اسی دیوانے، انیسویں صدی میں پوری زمین کا چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ ابھی اس جنون کی آگ سرد نہیں ہوئی، جیسا کہ ہے وُڈ (Heywood) نے لکھا ہے:

Nationalism has redrawn the map of the world and continues to do so,---(1)

دوسرا ''خطرہ'' مشرقی ایشیا کی طرف سے کنفیوشس ازم کی صورت میں موجود ہے جس نے چین میں، دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی کو پہلے ہی اپنے دام میں گرفتار کر رکھا ہے۔ اسلامی تہذیب کا ''نیٹ ورک'' (Net Work) تیسرا بڑا سوالیہ نشان ہے جو اپنے بنیادی اعتقادات اور عملی تمدن کے لحاظ سے لبرلزم کے لئے ''پریشانی'' کا روپ دھار رہا ہے۔ مسلمانوں کی شکل میں دنیا کی سب سے بڑی اجتماعیت ایسی موجود ہے جو ایک نظریہ زندگی سے وابستہ ہے۔

دین اسلام، قومیت پرستی اور کنفیوشس ازم اس لیے چیلنجز ہیں کہ وہ افراد معاشرہ کو ایک اخلاقی بندھن میں مجتمع کرتے ہیں جو یورپ کی انفرادیت پسندی سے

(1) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-57

ستائے ہوئے معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں:۔

Islam , confucianism and even authoritarian nationalism may yet prove enduring rivals to Western liberalism.(1)

اس پہلو سے دیکھا جائے تو سب سے بڑا خطرہ اسلام ہے جو افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں خاص طور سے معاشی اور سماجی طور پر کمزور ملکوں میں اپنی گرفت مظبوط کررہا ہے:۔

Indeed, Political Islam may prevail over liberalism in much of the developing world precisely because of its capacity to offer a non-western,indeed anti-western,stance.(2)

(دراصل 'سیاسی اسلام' ایک ایسا حریف ہے جو لبرلزم پر غلبہ پا سکتا ہے، خصوصاً ترقی پذیر خطوں میں...... کیونکہ اس (نظریۂ زندگی) میں ایک ایسی صلاحیت موجود ہے جو (لوگوں کو اپنی طرف لانے کا) نہ صرف 'غیر مغربی' بلکہ 'مغرب دشمنی' کا داعیہ رکھتی ہے۔

اسلام کے سب سے زیادہ "خطرناک" ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضابطہ زندگی، قومیت پرستی کے اتحاد سے بھی زیادہ مضبوط اور وسیع یکجہتی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں وہ اپنے آپ کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کرتا ہے:۔

Islam is not, and never has been just a 'religion'. Rather it is a complete way of life ,with institutions on moral, political and economic behaviour for individuals and nations alike.(3)

(اسلام کبھی بھی محض مذہبی عقیدہ نہیں رہا بلکہ یہ ایک مکمل طرزِ زندگی ہے جس کے اپنے ادارے ہیں، جو افراد اور قوموں کے اخلاقی، سیاسی اور معاشی رویوں کو

(1) Heywood, Political Ideologies, p-64
(2) *Ibid* (3) *Ibid*, p-304

ایک ساتھ ترتیب دیتے ہیں)۔

گویا اس سلسلہ میں پریشان کن مسئلہ سیاسی اسلام کی نشو ونما ہے۔ ویسے تو پوری دنیا میں تمام مذاہب اپنی اصل بنیادوں کے احیاء کے لئے کوشاں ہیں مگر اسلامی بیداری کو اس وقت بین الاقوامی سطح پر بنیاد پرستی Fundamentalism کا نام دیا جاتا ہے۔

ہے وڈ (Heywood) کی تحقیق کے مطابق بنیاد پرستی کی اصطلاح، دور جدید میں سب سے پہلے بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ میں استعمال ہوئی جب امریکی پروٹیسٹنٹ عیسائیوں نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ کے درمیان اپنے افکار اور بنیادی عقائد والے پمفلٹ ''فنڈا مینٹلزم'' کے نام سے شائع کیے، جبکہ آج یہ ایسے لوگوں پر چسپاں کی جارہی ہے جو بنیادی مذہبی اصولوں کو ہر شعبۂ زندگی میں زیادہ اہمیت دینے کے خواہش مند ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو مغربی جمہوریت کو معاشروں کے اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جدید سیاسی مفکرین مذہبی بنیاد پرستی کی لہروں کو جدیدیت کے خلاف ایک انقلاب سمجھتے ہیں:۔

---a revolt against modernity and secularization.
---a moral protest against decadence.
---(to) re-establish the link between the human world and the divine.(1)

......ایک انقلاب، جدیدیت اور لادینیت کے خلاف

......ایک اخلاقی احتجاج انحطاط کے خلاف

......تاکہ خدا اور انسانی دنیا میں ربط بحال ہو سکے۔

فنڈا منٹلزم، دراصل ایسے رویۂ زندگی کا نام رکھا گیا جو انسان کی انفرادی آزاد منشی کے بالعکس ہو۔ جو فرد کسی اصول حیات سے پختگی کے ساتھ وابستہ ہو اور اپنے نظریۂ زندگی کو سب سے قیمتی چیز سمجھتا ہو، بنیاد پرست کہلائے گا۔ ظاہر ہے ایسا

(1) Political Ideologies, p-291

رویہ لوگوں میں عام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ سماجی بے نیازی اور انفرادی مفاد پرستی سے توبہ کرتے ہوئے اجتماعی فلاح اور معاشرتی یکجہتی کو اپنا نصب العین بنالیں گے۔

بنیاد پرستی کا یہ پہلو وسیع المشربی اور آزاد خیالی کے پیدا کردہ معاشرتی خلا کو زیادہ بہتر طریقے سے پر کرسکتا ہے۔لہٰذا خود غرضی اور انفرادیت پسندی سے تنگ آئے ہوئے معاشرے روحانی سکون اور باہمی بھائی چارے کی چھاؤں تلے جانے کے لیے تیار ہو گئے تو لبرلزم کی دیوار دھڑام سے نیچے آسکتی ہے:

The problem liberalism has to face, however, is what happens when individuals embrace value systems and world views, such as religious fundamentalism,that call for the construction of non-liberal institutions.(1)

(لبرلزم کو، بہرحال، جس مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا وہ یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ (خود پرستی کے دائروں سے نکل کر) کسی اجتماعی سوچ کا نظام اور آفاقی نظریۂ حیات نہ اپنالیں، جس طرح کہ مذہبی بنیاد پرستی ہے۔ جو ایسے سماجی ادارے تعمیر کرنے کا سبق دیتی ہے جو (انفرادیت پسند) آزد منشی کے بالعکس ہیں۔)

اس تجزیے کے مقابلے میں جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں رابرٹ ڈال(Robert Dahl) کا نقطۂ نظر، جمہوریت پسندوں کے لیے حوصلہ افزاء ہے۔

ڈال سمجھتا ہے کہ جمہوریت دیگر نظام ہائے حکومت میں، جدید دور کی ضرورت کے لحاظ سے، زیادہ موزوں ہے۔اس کے خیال میں انسانی آزادی، شخصی نشو ونما اور فرد کے مفادات کا تحفظ، جمہوریت کے علاوہ کسی اور نظام سیاست میں بہتر طور پر ممکن نہیں۔لہٰذا جمہوریت کی یہ ضمانت، جہاں اسے پہلے مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے اسی طرح مستقبل میں اسے قائم رکھنے کے لیے سہارا بنے گی۔(2)

(1) Political Ideologies, p-64, (2) Democracy And Its Critics,p-315

تاہم اس کے خیال میں جمہوری ریاستیں اپنے نظام دوسرے ملکوں میں برآمد کرنے کے لحاظ سے محدود امکانات کی حامل رہیں گی۔ دوسرا یہ کہ، حقیقی جمہوریت کے لیے چونکہ تھوڑی آبادی کی ریاست ضروری ہے اور یہ سہولت اس وقت میسر نہیں ہے لہٰذا ایسی چھوٹی سیاسی اکائیاں، مستقبل قریب میں دکھائی نہیں دیتیں جو آزادی اور خودمختاری کے مثالی نمونے بن سکیں:۔

A world consisting only of very small and highly autonomous political units is out of the question.(1)

زمینی حقائق (Ground Realities) کے اس منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے نوبرٹو بابیو Noberto Bobio نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ:

No true democracy has ever existed nor ever will.(2)

سیاسی مفکرین کے ایک طبقہ نے مستقبل میں، سیاست کے خاتمہ (End Of Politics) کا نظریہ پیش کیا تھا۔ جس کی نسبت کارل مارکس (Karl Marx) اور اس کے مریدین کی طرف ہے۔ ان کے خیال میں معاشی وسماجی مساوات کے نتیجے میں ریاست غیر ضروری ہو جائے گی۔ اس طرح یہ لازم برائی (Necessary Evil) اور اس کی مقبولیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لہٰذا ریاست نہ ہو گی تو سیاست کیسی۔

ڈینائل بل (Daniel Bell) نے اس میں یہ اضافہ کیا تھا کہ یہ دراصل سیاست کا خاتمہ نہیں نظریے کا خاتمہ (End Of Ideology) ہے۔ اس کے بقول سیاسیات نے معیشت پر برتری حاصل کر لی ہے جبکہ سیاست اب صرف حکومت سے متعلق فنی سوالات کی ایک سائنس بن گئی ہے۔

اب فوکو آما (Fukayama) نے یہ نظریہ پیش کر دیا ہے کہ نظریے کا خاتمہ دراصل تاریخ کا خاتمہ (End Of History) ہے۔ سرمایہ داری کا نظام سیاست، سرد

(1) Democracy And Its Cricits, p-322

(2) Democracy And Dictatorship, p-152

جنگ کے معرکہ سے، فاتح ہو کر نکلا ہے۔ مستقبل میں اشتراکی فکر کا اختتام ہوگا اور ایک وسیع پیمانے پر مقبول عام، آزادانہ جمہوریت کا دور آئے گا۔ جس کے دو اجزا ہونگے:۔

Competitive Political System + Capitalist Economy. (1)

اس کے خیال میں یہی مستقبل کا نظریہ ہے جو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن خاتمے کا یہاں خاتمہ نہیں ہوتا..........

بلکہ جدیدیت کا خاتمہ (End Of Modernity) آخری نعرہ ہے جو اس سلسلے میں لگایا گیا اور اسے جے ایف لائی اوٹرڈ سے منسوب کیا گیا۔ اس نقطہ نظر کا پرنالہ بھی جدید آزادانہ جمہوریت کے صحن میں گرتا ہے جس کے مطابق مستقبل ایسی جمہوریت کا ہے جو زیادہ عوامی مشاورت اور عوامی آزادی وخودمختاری کے راستے کھولے گی۔(2)

دوسرے لفظوں میں جمہوریت کو مزید جمہوری ہونا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے ہردلعزیز ہو جانے کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ حاکمیت کا تاج پہننے والوں اور محکومی کا طوق گلے میں ڈالنے والوں کے درمیان حائل، خلیج کو کیسے پر کیا جائے۔ حاکم ایک فرد ہو یا ایک جماعت اور طبقہ........ یہ مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

مطلق العنان قوت حاکمہ اور بے بس عوام الناس کے درمیان میں موجود، اس بعد (Gap) کے خاتمہ کے لیے پہلے پہل تعلیم وشعور کے پھیلاؤ کو بہترین ذریعہ سمجھا گیا۔ پھر یہ کام ذرائع ابلاغ اور سائنس وٹیکنالوجی کے ذمے لگا۔ مسئلہ حل نہ ہوا تو جمہوریت کے جدید مغربی ماڈل سے امیدیں وابستہ کی گئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب جمہوری نظام اپنے عروج پر پہنچا اور وہ بھی یہ مسئلہ حل نہیں کر پایا، تو دنیا

(1) Heywood, Political Ideologies, p-321, (2) *Ibid*, p-322

کی بہت بڑی آبادی نے سرمایہ داری اور اس کے پروردہ جمہوری نظام کے خلاف بغاوت کردی۔ سماجی اور معاشی جمہوریت کے نعروں نے سوشلزم کی شکل میں، ایک روشن مستقبل اور جنتِ ارضی کے سبز باغ دکھائے۔ اشتراکی انقلاب کی 'مشینی مساوات' بھی بنیادی مسئلہ حل نہ کرسکی۔ بیسویں صدی کے اختتام کے ساتھ اشتراکیت کا طلسم ٹوٹ گیا، جب بقول اقبالؒ یہ ثابت ہوگیا کہ:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

(1)

سوشلزم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے پرولتاری استبداد کے عملی تجربہ سے گذرنے کے بعد، پھر جمہوریت کی طرف نظریں لگائی گئیں۔

بقول آر بلاسٹر Arblaster کے، اب یہی سمجھا جارہا ہے کہ یہ گھاٹی جمہوریت ہی کے ذریعے عبور ہوگی:

It remains the challenge of democratic theory to provide a bridge.(2)

اب اس چیلنج کو پورا کرنے کے لیے جمہوریت کو مزید جمہوری بنانے کا نعرہ لگایا جارہا ہے۔ لیکن یہ عمل اسی صورت میں ثمر بار ہوسکے گا جب وہ حقیقتاً انسانی معاشرے میں آقا و غلام کی اس تفریق ختم کرنے کا باعث بن جائے، جو اس وقت معاشروں کے اندر، معاشی سطح پر طبقاتی تقسیم کی صورت میں موجود ہے اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی و عسکری لحاظ سے، حاکم اور محکوم قوموں کے دو طبقوں کی شکل میں کارفرما ہے۔

---

(1) کلیات (اردو): 201

(2) Anthony Arblaster, Democracy, p-19

آج کے سیاسی ماہرین کے لئے سوال یہی اہم ہے کہ اس تمیز بندہ و آقا کو، ختم کیسے کیا جائے؟......

راجرایٹ ویل(Roger Eatwell)نے اس الجھن کو یوں پیش کیا ہے:

But the crucial question is indeed how to emancipate from masterhood, how to use decentralization as a means to abolish alienated power both at the level of global society and within each communtiy.(1)

اس تناظر میں، مستقبل کے سیاسی منظرنامے کے حوالے سے، آج کل جو لفظ سب سے زیادہ استعمال ہو رہا ہے وہ ہے گلوبلائزیشن(Globalization)۔

یہ اصطلاح شروع میں دراصل معاشی اصلاحات کے زمرے میں، فری مارکیٹ اکانومی(Free Market Economy)کے تصور کے ساتھ استعمال ہوئی۔ مگر روز بروز اس کے مفہوم میں وسعت لائی گئی ہے۔ اور عملاً اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نعرہ معاشی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے عالمی سطح پر سرمایہ داری اور جمہوریت کے پھیلاؤ کا اعلان ہے۔

غریب اور ترقی پذیر ممالک کی مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو معاشی تنگی اور تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے جمہوریت ترقی نہیں پا سکتی اور...... دوسری طرف صنعت اور ٹیکنالوجی نہ ہونے کی وجہ سے تجارت اور کاروبار جمود کا شکار رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں تیسری دنیا کے ممالک کی بے بسی قابل رحم صورت حال سے دوچار ہے جبکہ ''سرمایہ دارانہ انصاف'' کی حامل اقوام، آفاقیت (Globalization) کا صور پھونکنے والی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے گلوبلائزیشن کی مہم جوئی میں بھیڑ اور بھیڑیئے کا مقابلہ، دونوں کو یکساں آزادی دے کر، کروایا جائے گا۔ یوں پیشہ وارانہ،

---

(1) Roger Eatwell And Anthony, Contemporary Political Ideologies, p-120

فنی مہارت کا طوفان تجارت، پیشہ وارانہ فنی معذوری کا میدان مار لے گا۔ کیا یہ بھی ایک جمہوری فکر کا عملی مظاہرہ ہوگا؟

آفاقیت یا عالمگیر انسانی اجتماعیت، نیا خواب نہیں۔ بیسویں صدی کے جنونی نیشنلزم نے جب پوری دنیا کو آگ کے آلاؤ میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اور اس صدی کے پہلے نصف ہی میں انسانیت کو یکے بعد دیگرے دو عظیم جنگوں میں جھونک دیا تو قوموں کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور لیگ آف نیشنز (League Of Nation) کا ادارہ معرض وجود میں آیا۔ یہ گویا کان کو الٹی طرف سے پکڑنے والی بات تھی کہ پہلے انسان کو کئی قوموں میں تقسیم کر دیا جائے پھر انہیں قوموں کے نام پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلیوں کے دمیں اکٹھی باندھ دینے سے ان کے درمیان اتحاد کیسے قائم ہوسکتا ہے؟...... علامہ اقبالؒ نے، دانش افرنگ کی اس جادوگری کے بارے میں کہا تھا:

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!

(1)

جب اہل نظر کو یہ احساس ہوا کہ قومیت پرستی کا علاج نہ کیا گیا تو یہ جنون کئی قوموں کے سفینے ڈبودے گا...... تو اس وقت اس بین الاقوامی لاقانونیت (International Anarchy) (2) کو قابو کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔

دوسری جنگ عظیم اقوام متحدہ (U.N.O) کے وسیع ادارے پر منتج ہوئی۔ لیکن کیا کریں اس انسانی فکر کی کوتاہی کا کہ سیاسی مجبوری کے تحت بننے والے اس ادارے کی دیواروں میں خود روحِ جمہوریت چن دی گئی۔ ویٹو پاور (Veto Power) کی

(1) ضرب کلیم، کلیات (اردو): 26

(2) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-71

صورت میں جمہور کے ساتھ ہاتھ ہوگیا۔ اور یوں استعمار کو اپنی مرضی منوانے کے کئی قانونی راستے مل گئے۔ اس ''گرگ آشتی'' یا (Cold War) کے سائے میں بین الاقوامی ادارے بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ عالمگیر تعاون کی یہ فضاء، اُن دفاعی اور معاشی معاہدوں سے پیدا ہوئی تھی جو دراصل بین الاقوامی مسابقت میں ایک طرح کی نئی صف بندی کے لئے ترتیب دیئے گئے تھے۔ اس فکر کے نتیجے میں درج ذیل اداروں نے جنم لیا:۔

SEATO, NATO, Warsaw Pact, GATT, NAFTA Etc.

عالمی انسانی قیادت کے اس طرز عمل سے سیاسی مفکرین نے یہ اندازے لگانا شروع کئے کہ آنے والا دور قومیت یعنی Nationalism کی بجائے بین الاقوامیت یعنی Supernationalism اور Internationalism کا ہے۔ لہٰذا قومی ریاستوں کا مستقبل، بظاہر خطرے سے دوچار محسوس ہوا، جیسا کہ ہے وُڈ (Heywood) کا خیال ہے:۔

The Nation-State may also have little future in an economic order increasingly dominated by multinational companies and international patterns of trade.(1)

(ایک ایسے معاشی نظام میں، جہاں کثیر القومی کمپنیاں غالب ہوں، اور تجارت کا بین الاقوامی اصول کارفرما ہو، قومی ریاستوں کا مستقبل معدوم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔)

تاہم اب یورپی یونین کے ارتقاء سے، مستقبل، ایک بین الاقوامی وفاق اور ایک آفاقی ریاست (A Global State) کی صورت میں نظر آنے لگا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کی فتح نے Globalization کو مستقبل کی ایک حقیقت کے طور پر منوالیا ہے۔

(1) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-65

لہٰذا اس وقت تین طرح کی آفاقیت کے معرض وجود میں آنے کی پیشگوئیاں کی جارہی ہیں:۔

The Cosmopolitan Nation.

Cultural Pluralism.

Cosmopolitan Democracy.(1)

لیکن اگر آج کی دنیا کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو خدشہ نظر آتا ہے کہ شاید یہ خواب ابھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکیں گے۔

آج کی ....جمہوریت پسند، آزاد اور مہذب دنیا..........قوم پرستی کی زنجیروں میں بری طرح سے جکڑی ہوئی نظر آرہی ہے۔ جب تک قومی مفادات کے دلکش نعروں میں جان باقی ہے، اس وقت تک آفاقی ریاست کے امکانات، ایک سہانے خواب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اینڈریو ہے وُڈ (Andrew Heywood) نے اس خدشے کا اظہار یوں کیا:

However so long as nationalism continues to exert a potent appeal, the prospect of a global state, underpinned by the idea of world citzen-ship, will remain a utopian dream.(2)

(بہرحال جب تک قومیت پرستی کا جنون اپنے اثرات چھوڑتا رہے گا، اس وقت تک ایسی آفاقی ریاست کا تصور جو کہ ایک عالمگیر شہریت کے نظریئے کے ساتھ وابستہ ہے، دیومالائی خواب ہی رہے گا۔)

ایسے اندیشوں کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے قومیت پرستی کے منفی پہلوؤں میں سے ایک ہی مثال کافی ہے۔ آج کی دنیا کے مجموعی ماحول کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئی گی کہ صنعتی انقلاب اور قومی مسابقت (Competition) کی محدود ذہنیت

(1) Giddens, The Consequences of Modernity, p-64, The Third Way, p-93

(2) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-76

نے، لامحدود ماحولیاتی آلودگی (Environmental Pollution) پیدا کر رکھی ہے جو مستقبل کی زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قومی مفادات (National Interests) کے تحفظ کی مجبوری، صنعتی ملکوں کو ماحولیاتی تطہیر کے عمل سے روکے رکھ رہی ہے۔ مثلاً امریکی سینٹ اور حکومت کا یہ اصرار ہے کہ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ پھیلانے والے صنعتی ادارے بند نہیں کریں گے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی قومی ترقی وابستہ ہے!۔ دنیا کی کل آبادی کا یہ 4 فیصد حصہ، کل آلودگی کا 25 فیصد پیدا کرتا ہے۔ بے چاری جمہوریت کا کیا بنے گا کہ قومیت کا ''معصوم'' جذبہ، 4 فیصد کو بچانے کے لئے 96 فیصد کو زہر دینے پر اصرار کر رہا ہے۔!!

باب ششم

جدید جمہوریت اور اسلامی اصول سیاست

جدید دنیا کی سماجی زندگی میں سیاسیات کے دائرے وسیع اور پیچیدہ صورتحال اختیار کر گئے ہیں۔ ایسے حالات میں سیاست ایک وسیع سائنس بن چکی ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ، اپنی اصطلاحات، ادارے، طریق کار، اور حکمت عملی ہے۔ جدید دور میں یہ سارا نظام جمہوریت کی چھتری تلے سانس لے رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جمہوری فکر و عمل کے تناظر میں سیاست انسانی کے مختلف پہلو، اسلام کی آفاقی تعلیمات سے کہاں کہاں مطابقت رکھتے ہیں اور کہاں کہاں انسانی فکر کی نارسائی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ اس تجزیئے سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جمہوری طرزِ سیاست و حاکمیت کے پس منظر میں کونسی فکری کوتاہیاں کارفرما ہیں، جن کی وجہ سے انسان کی سیاسی و سماجی زندگی سرابوں کا شکار ہو گئی ہے۔

سیاست اور جمہوریت
(Politics & Democracy)

قرآن مجید میں لفظ سیاست مذکور نہیں۔ اس مفہوم کے لیے قرآن حکیم کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ زمینی اقتدار اور حاکمیت کے تصور کو الفاظ قرآنی میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"تمکن فی الارض، استخلاف فی الارض، تحکم بین الناس"

یہ اصطلاحات درج ذیل، آیات سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) ﴿الَّذِينَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ............﴾

(اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرینگے............)

(۲) ﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ......﴾

(وعدہ کیا اللہ نے تم میں سے ایسے لوگوں کے ساتھ وہ ایمان لائیں اور اعمال صالح کریں تو اللہ انہیں ضرور زمینی اقتدار دے گا۔)

(۳) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ......﴾

(بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل لوگوں کو پہنچاؤ اور انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے ساتھ فیصلے کرو)(1)

ان آیات میں انسانی معاشرت کی اجتماعی تنظیم، اس کی اصلاح، حکومت کے نظام اور عدل گستری کے آداب کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ انہیں اصولوں کو آج کے دور میں سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی سیاست کو استصلاح الخلق (مخلوق کی اصلاح کا کام) قرار دیتے ہیں اور علامہ ابن خلدون نے اسے کفالة للخلق و خلافة اللّٰه (مخلوق کی سرپرستی اور اللہ کی نیابت) سے موسوم کیا ہے۔(2)

عربی زبان میں لفظ سیاست ساس یسوس سوس سے ماخوذ ہے جس کے معنی اصلاح کرنے اور سنوارنے کے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے اس کا معنی تدبیر ریاست یعنی ملک وقوم کی تعمیر وترقی کے لیے کام کرنا ہے۔ اسی سے سائیس نکلا ہے جس کے معنی سرداری وراہنمائی کے ہیں۔(3)

گویا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاست اس تدبر اور حکمت کا نام ہے جو

---

(1) الحج:41، النور:55، النساء:58 (2) احیائے علوم الدین:1/9، مقدمہ:113

(3) ابن منظور، لسان العرب:6/108، مرتضٰی زبیدی، تاج العروس:4/169

انسانی معاشرے کو منظّم کرنے، اس کی اصلاح کرنے اور اس کا نظم و نسق چلانے کے لیے درکار ہے۔

عربی کے لفظ سیاست کے مقابلے میں انگلش لفظ Politics استعمال ہوتا ہے۔ یہ یونانی زبان (Greek کے Polis) سے ماخوذ ہے جو شہری ریاست کے لیے استعمال ہوتا تھا۔لہٰذا پالیٹکس یا سیاسیات، شہری حکومت کے علم وفن کو کہا جاتا ہے۔اب یہ صرف ایک فنِ حکومت کے طور پر مقبول ہے۔سیاست کے وسیع مفہوم میں ریاست و حکومت کے تمام امور شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح انسان کی اجتماعی زندگی کے سبھی دائروں سے اس کا تعلق مربوط ہو گیا ہے جیسا کہ (Soltau) کہتا ہے:۔

Politics is the concern of everybody with any sense of responsibility.(1)

جمہوریت بنیادی طور پر سیاست کے ایک حصے، حکومت کی تنظیم اور طریق کار سے منسلک ہے۔عربی زبان سے ماخوذ یہ لفظ، انگریزی کے Democracy کے متبادل کے طور پر مقبول ہوا ہے۔جمہوریت کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں اکثریت اور نمایاں یا نمایاں اکثریت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔(2) جبکہ سیاسیات کی یہ اصطلاح اپنے وسیع مفہوم میں ایسے طرزِ حکومت کے لئے بولی جاتی ہے جس میں، کسی ریاست کی حکومت، رعایا کی اکثریت کی مرضی کے تابع ہو۔انگریزی میں ڈیموکریسی کا لفظ جو کہ یونانی زبان سے ماخوذ ہے، لغوی مفہوم کے لحاظ سے ''لوگوں کی حکومت'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(3)

جمہوریت اسی وقت عمل میں آتی ہے جب عوام الناس کی اکثریت بالواسطہ یا براہِ راست، اقتدار میں شریک ہو:

---

(1) An Introduction To Politics, p-2

(2) ابن منظور، لسان العرب:4/149، مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس:10/215

(3) David Held, Models of Democracy, p-1, 2

A complete democracy would consult all of its citizens upon all matters...It gives citizens not merely the sense of sharing in decisions, but the actual opportunity to influence its substance.(1)

(ایک مکمل جمہوریت تمام معاملات، سارے شہریوں کے مشورے سے چلاتی ہے۔ یہ شہری کو نہ صرف فیصلوں میں شرکت کا احساس اور اعتماد دیتی ہے، بلکہ ایک حقیقی موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ معاملات کی اصل پر بھی قابل ذکر حد تک اثر انداز ہوسکیں۔)

اسی بنیاد پر قدیم وجدید سیاسی مفکرین نے اسے عوام کی حاکمیت Rule of People اور ایک یا چند کے مقابلے میں زیادہ (یعنی عوام الناس) کی مرضی کے تابع حکومت قرار دیا ہے۔ اس لیے یہ حکومت وریاست اور اجتماعیت کے تمام مسائل میں اکثریت کی رائے کے اصول (Majority Principle) کو ترجیح دیتی ہے۔(2)

جمہوریت کا یہ تصور اسلامی اصول سیاست کے منافی ہے۔ قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ سے اس کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ قرآن نے اکثریت کی حکمرانی کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اکثریت کے بے سوچے سمجھے رویے کو بطور اصول تمدن اپنانے سے سختی سے روک دیا ہے:۔

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ﴾(3)

(اور اگر آپ زمین میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت کی مانند تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت جیسے معاملے کو اگر اکثریت کے

(1) Michael Stewart, Modern Forms of Government, p-56

(2) Noberto Bobio, Democracy And Dictatorship, p-140

(3) الانعام:116، المائدہ:77

حوالے کردیا جائے تو انسانیت، تعمیر کی بجائے تخریب کے راستے پہ چل نکلتی ہے۔(1) ایسی قومیں جو اکثریت کی منفی سرگرمیوں کو روکتی نہیں ہیں اور ایسے رویے ہی ان کے اجتماعی اخلاق کی علامت بن جاتے ہیں تو اللہ کی ناراضگی، عذاب کی صورت میں ان پر نازل ہو جاتی ہے۔قرآن نے قدیم انسانی معاشروں کا ذکر ایسے قومی اور اجتماعی گناہوں اور جرائم کی مذمت کے ساتھ کیا ہے لہٰذا عوام الناس یا اکثریت کی ایسی قیادت اور حاکمیت مکروہ قرار دے دی ہے۔(2)

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے حکمرانوں، بادشاہوں اور سربراہوں کا ذکر صیغۂ واحد میں...... خلیفہ، امام، ملک اور حکم ...... کے الفاظ کے ساتھ کئی مقامات پر کیا ہے۔(3)

اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے اچھے اور برے حکمرانوں کے تذکرے میں اچھے بادشاہوں اور ان کی اعلیٰ کارکردگی پر تبصرہ فرمایا ہے جیسے کہ ذوالقرنین، طالوت اور ملکہ سبا۔لیکن جمہور کی فرمانروائی کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔البتہ، وہ قوم کے حکمران طبقے کا ذکر ملاء القوم کے نام سے کرتا ہے۔(4)

اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ قرآن مجید، ملوکیت یا بادشاہت کے نظام حکومت کو مثالی قرار دیتا ہے بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن حکیم اچھی حکمرانی کا مجوز اور مؤید ہے کیونکہ اس نے برے حکمرانوں اور بادشاہوں کی مذمت بھی کی ہے۔(5)

جمہوریت کے حقیقی مفہوم کو سامنے رکھیں (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں نقل کی جانے والی، سیاسی مفکرین کی آراء سے ظاہر ہے) تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس سیاسی فکر کے علمبردار، عوام الناس کو حاکمیت یا اقتدار کا اصل مالک تصور کرتے ہیں۔ یہ

---

(1) سید مودودی، تفہیم القرآن:1/576، (2) الانعام:6، الحج:45،

(3) البقرۃ:30، یوسف:43، یونس:109، المائدہ:42، البقرۃ:124

(4) الکہف:83 تا 98، البقرۃ:247، النمل:23 تا 44 (5) صٓ:12، النمل:34

فکر اپنے اصل کے لحاظ سے زمین پر انسان کو خدا بنانے والی بات ہے۔(نعوذ باالله من ذالك) ظاہر ہے یہ تصور قرآنی تعلیمات کے صریحاً منافی ہے۔قرآن پاک نے زمین میں انسانی اختیار و تصرف کو لفظ خلیفہ میں سمو دیا ہے۔﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط﴾(1) یہ لفظ انسان کے لئے متعین مقام، نیابت، نمائندگی اور انسان کے عزّ و شرف پر دلالت کرتا ہے۔(2) جس سے خود بخود یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اقتدار کا مالک نہیں، امین ہے۔ یہ حاکمیت اس کی ملکیت نہیں بلکہ اصل مالک کی عطاء ہے جو ایک خاص مہلتِ عمل تک کے لئے ہے۔ ﴿وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ o﴾(3) لہٰذا اسلامی اسلوبِ سیاست میں مروجہ جمہوریت کے بالمقابل خلافت کا اصول کارفرما ہے۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کی رضامندی کا دخل ضرور ہے مگر یہ حکومت لوگوں کی اکثریت کی خواہشات کے تابع ہو کر نہیں چلتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہوتی ہے اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے:

﴿فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ o﴾(4)

حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافت کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ فیصلے انصاف کے مطابق کئے جائیں اور ہوائے نفس کی پیروی سے اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط﴾ (5)

(اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے، پس آپ لوگوں کے درمیان سچائی کا فیصلہ کیجئے اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔)

(1) البقرۃ:30، (2) راغب اصفہانی، المفردات:155 تا 156 (3) البقرۃ:36،
(4) البقرۃ:38، (5) صٓ:26

ریاست اور حاکمیت

(State & Sovereignty)

جدید جمہوری فکر میں ریاست کو انسان کا تخلیق کیا ہوا ایک ادارہ گردانا گیا ہے جو انسانی معاہدہ عمرانی کے تحت معرض وجود میں آیا ہے۔انسان نے ریاست اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ترتیب دی ہے لہذا اس پر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) کا اختیار بھی انسان ہی کو حاصل ہے۔ قدیم مفکرین میں افلاطون (Plato)اور ارسطو(Aristotle) اور جدید سیاسی ماہرین میں ہابز(Hobbes) لاک(Locke)اور روسو(Roussea)اس کے علمبردار ہیں۔

جمہوری طرز عمل کے اس پہلو کا فکری پس منظر یہ ہے کہ انسان خود ہی معیار خیر وشر ہے۔یعنی یہ کہ وہ خود یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ صحیح اور غلط، مفید اور مضر...... حتیٰ کہ جائز اور ناجائز کیا ہے۔یہ تصور قدیم یونان کے سوفسطائی فلاسفہ نے پیش کیا تھا۔

Man is the measure of all things.... things are for each man what they seem to each man.(1)

بعد میں یہی فلسفہ یورپی نشاۃ ثانیہ(Renaissance) کا روحِ رواں بنا:۔

For the renaissance, on the other hand, man is more important than God, and man's relations to his fellows more important than his soul's relation to the deity.(2)

(دوسری طرف، نشاۃ ثانیہ میں انسان خدا سے زیادہ اہم ٹھہرتا ہے۔اور ایک انسان کا دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ تعلق، خدا اور روح کے تعلق سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔)

مغرب کی نشاۃ ثانیہ دراصل اسی تصور کے دوبارہ احیاء ہی کا دوسرا نام تھا

---

(1) Ernest Barker, Greek Political Theory, p-70

(2) Edward Mccheseny, Masters Of Political Thought, p-27

جس کی عملی صورت جمہوریت کے روپ میں ظاہر ہوئی اور اس کا بنیادی فلسفہ یہ طے پایا کہ:۔

The state is only there to give individuals their fullest opportunity of living a good life, they , not the state , being the judge of what goodness, is for them, And finally , the authority cannot come from above or from outside, its only source is the people themselves.(1)

(ریاست دراصل افرادِ معاشرہ کو ایک اچھی زندگی گذارنے کے مکمل مواقع فراہم کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور یہ کہ اپنے لئے ''اچھائی'' کا فیصلہ کرنے کا اختیار خود افراد کو حاصل ہوتا ہے، ریاست کو نہیں۔ اور اس سلسلہ میں آخری نقطہ یہ ہے کہ اختیار حاکمیت کا بنیادی سرچشمہ لوگ خود ہوتے ہیں...... یہ کہیں عالم بالا یا عالم خارجی سے وارد نہیں ہوسکتا!)

قرآن مجید نے اس فلسفے کی واضح طور پر تردید کی ہے:۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾۔(2)

حکم نہیں ہے کسی کا سوائے اللہ کے۔ اس نے فرمادیا ہے کہ بندگی نہ کرو مگر اسی کی...... یہی ہے راستہ سیدھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

گویا نہ صرف یہ حقیقت ہے کہ حاکمیت انسان کی نہیں ہے بلکہ انسان کا اس دنیا میں صرف یہ کردار ہے کہ وہ اللہ کا عبد اور محکوم بن کے رہے۔ قرآن نے خصوصاً انسان کے اس عمومی رویے کا ذکر (پہلی ہی سورۃ میں) کیا ہے جو وہ اپنی اس حیثیت کو بھلا کر، دنیاوی وسائل کی بنا پر، اختیار کرلیا کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے

(1) Soltau, An Introduction To Politics, p-169

(2) یوسف:40

ایک دن اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر جوابدہ ہونا ہے:۔

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ o اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى o اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى o﴾(1)

ہرگز نہیں بلکہ (اس) انسان نے بغاوت کی، اپنے آپ کو بے نیاز سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے!

'طغی' کا معنی حد اعتدال سے نکل جانا ہے۔ اسی سے طاغوت کا لفظ ماخوذ ہے۔ اللہ کے مقابلے میں جس کی حاکمیت تسلیم کی جائے اسے قرآن طاغوت قرار دیتا ہے:۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ o﴾ (2)

پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ ہی (کی حاکمیت) پر ایمان لائے اس نے اپنے آپ کو مضبوط سہارے سے جوڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سنتا بھی اور جانتا بھی ہے!

قرآن مجید کے مطابق انبیاء کی بعثت، انسان کو اسی راستے کی طرف، یعنی طاغوت سے انکار اور اللہ کی حاکمیت پر ایمان لانے کی ہدایت کے لئے ہوئی ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(3)

اور تاکید ہم نے ہر امت میں رسول اس لئے مبعوث کئے تا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر لیں اور طاغوت سے اجتناب کی راہ اختیار کر لیں۔

(1) العلق:6 تا 9 (2) البقرۃ:256، (3) النحل:36

طاغوت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے بندہ اپنی حد بندگی سے آگے نکل جائے، خواہ اس کی پرستش کی جائے یا اتباع اور اطاعت۔ ہر قوم کا طاغوت وہ ہے جس کے پاس وہ فیصلہ کرانے کے لئے اپنے معاملات لے جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے مقابلہ میں۔(1)

گویا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسان کا اختیار حاکمیت کا مالک بننا، طاغوت کے مترادف ہونے کا نام ہے جو کہ اسلامی اصول سیاست کے خلاف ہے۔

اسلامی حاکمیت کا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و اقتدار پر ایمان لاتے ہوئے حکومتی ذمہ داری اور اختیار کو اللہ تعالیٰ کی امانت مانا جائے۔ ہاں! اس کی ادائیگی میں عوام یا رعایا کی رضا مندی، مفاد اور فلاح کو پیش نظر رکھا جائے، بجائے اس کے کہ اللہ کے مقابلے میں انسانی اجتماعیت اور اس کی خواہشات کو بھی حاکمیت اعلیٰ کا درجہ دے دیا جائے۔

عربی زبان میں لفظ ریاست ''رأس'' سے لیا گیا ہے، جس کے معنی چوٹی اور سربراہی کے ہیں اس کے لئے (اسلامی تاریخ میں) ولایۃ اور دولۃ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔(2)

قرآن کریم میں ریاست کے لئے ارض، سلطان اور ملك کے الفاظ آئے ہیں اور اقتدار کے لئے حکم اور امر کے۔ جبکہ لفظ سلطان اور ملک میں ریاست اور حاکمیت اعلیٰ، دونوں مفہوم، بیک وقت شامل ہیں، جسے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

ا) ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (اسی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا اقتدار)

---

(1) سید مودودیؒ، تفہیم القرآن: 1/367،

(2) ابن منظور، لسان العرب: 5/79، روحی بعلبکی، المورد: 556،

۲) ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْأَمْرُ ط﴾ (خبردار! اسی نے پیدا کیا اور اسی کا حق ہے حکم دینا)

۳) ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ o﴾ (بابرکت ہے وہ ذات، جس کے ہاتھ میں اقتدار و حاکمیت ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

۴) جناب رسول پاک ﷺ کی دعا: ﴿وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ أَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيرًا o﴾ (اور کہہ دیجئے کہ اے میرے پروردگار مجھے جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنے ہاں سے ایک ریاست واقتدار کو میرا مددگار اور سازگار بنا دے۔)

۵) ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ......﴾

(مانو کہ اے پروردگار تو ہی اقتدار (ریاست) کا اصل مالک ہے۔ تو جسے چاہے سلطنت عطا کر دے اور جس سے چاہے واپس لے لے۔)(1)

گویا اسلامی اصول سیاست کے مطابق یہ ایمان ضروری ہے کہ ریاست اور اس میں قائم اقتدار اعلیٰ کا اصل خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے ساتھ یہ حکمت بھی بیان کر دی گئی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ تخلیق کیا، اس لئے وہی اس کا حق ملکیت رکھتا ہے اور وہی اس کا اصل مقتدر ہے۔ دراصل اسی حکمت میں یہ حقیقت افشاء کر دی گئی کہ انسان خالق نہیں مخلوق ہے اور مالک نہیں نائب اور امین ہے۔ لہٰذا اقتدار کی ملکیت عوام کے پاس نہیں ہے۔ زمین کے محدود اختیارات میں

(1) الفرقان:2، الاعراف:55، الملک:1، الاسرآ:80، آل عمران:26

انسانوں کو اللہ کی طرف سے خلیفہ بنایا جاتا ہے:

۱) ﴿وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (اور وہی ہے جو تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے)

۲) ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ......﴾

(وہی اللہ ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفے کے طور پر بھیجا ہے۔ پس جو اس سے جو منہ موڑے اسی پر ہے اس کا انکار کی ذمہ داری!)(1)

لہٰذا زمینی اقتدار انسان کے پاس ایک امانت کے طور پر اس کے اصل مالک کی طرف سے حوالے ہوا ہے، وہی اسے عطا کرنے اور واپس لینے کا اختیار رکھتا ہے۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے، خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اختیارات اصل مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔(2)

(1) الانعام:165، فاطر:39 (2) سید مودودیؒ، تفہیم القرآن:26/1

ملک اور قوم
(Country & Nation)

جدید ریاست کی بنیاد چار عناصر پر رکھی گئی ہے (i) آبادی (ii) علاقہ (iii) اقتدار اعلیٰ (iv) حکومت۔ آج کل ان چاروں حدود پر مشتمل انسانی آبادی کو سیاسی زبان میں ایک قوم کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں قوم کا متبادل لفظ (Nation) ہے جو کہ تیرہویں صدی میں لاطینی (Latin) لفظ Nasci سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی پیدا ہونے کے ہیں۔ گویا Nation سے مراد لغوی معنوں کے لحاظ سے، ایسا گروہ ہے جو ایک علاقے کے ساتھ پیدائشی طور پر منسلک ہو:

A breed of people or a racial group.(1)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے لفظ کو ملک Country یا ریاست State کے ہم معنی کے طور پر لینا درست نہیں۔ جیسا کہ کسی ملک کی شہریت یا رکنیت کے اظہار کے لیے کسی فرد کے نام کے ساتھ قومیت Nationality کے لفظ کا استعمال، مغالطہ پیدا کرتا ہے۔ شہریت یعنی Citizenship اور قومیت یعنی Nationality الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے ایک ملک کے شہری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان دو الفاظ کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

یہی بنیادی مغالطہ ''اقوام متحدہ'' (United Nations) کے نام میں موجود ہے۔ اقوام متحدہ بنیادی طور پر ریاستوں یا ملکوں کے اتحاد کا نام ہے، قوموں کا نہیں (2)

قوم اپنے وسیع تر مفہوم میں ایسے گروہ انسانی کے لیے استعمال ہونا چاہیے جو نسل، مذہب، رہائش زبان اور تہذیب کا اشتراک رکھتا ہوئے اسی بنیاد پر

(1) Andrew Heywood, Political Ideologies, p-152
(2) Political Ideas And Concepts, p-57

ہیوڈ(Heywood)نے اسے سیاسی کی بجائے ثقافتی اجتماعیت کا نام دیا ہے۔وہ لکھتا ہے:۔

A 'Nation' is a cultural entity, a body of people bound together by a shared cultural heritage. It is not therefore, a political association, nor is it necessarily linked to a particular territorial area.(1)

(قوم دراصل ایک ثقافتی وجود کا نام ہے، یہ ایسے لوگوں کی اجتماعیت ہے جو مشترکہ ثقافتی ورثے کی بنیاد پر مجتمع ہوئے ہوں۔لہٰذا یہ کوئی سیاسی اجتماعیت نہیں ہوتی نہ ہی لازمی طور پر یہ منسلک ہوتی کسی خاص جغرافیائی خطے کے ساتھ۔)

اس اشتراک کی بنیاد دراصل...... ایک ہونے کا احساس ہے۔ یہ قومی وحدت وہ لازمی عنصر ہے، جسے جذبہ قومیت یا Spirit of Nationality کہتے ہیں۔ اس احساس یگانگت کے بغیر کوئی قوم معرض وجود میں نہیں آتی۔بھلے اس میں درج بالا اشتراک پوری طرح موجود ہو۔

جدید جمہوری فکر کے اس تصور قومیت کو سامنے رکھتے ہوئے، اب ہم اسلامی اصول سیاست کی روشنی میں اس کا محاکمہ کریں گے۔ جہاں تک لفظ ملک کا تعلق ہے۔قرآن میں یہ لفظ ریاست اور حاکمیت دونوں معنوں میں اور دونوں تصورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔(2)(تفصیل گذشتہ صفحات میں آچکی ہے۔)

ذیل میں ہم لفظ قوم اور اس کے اسلامی تصور کی تحقیق کریں گے۔

عربی زبان میں قوم کا لفظ اگرچہ صرف مردوں کے گروہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے(3) مگر قرآن مجید میں اس سے مراد مردوں اور عورتوں کی مشترکہ جماعت یا اجتماعیت ہی لیا گیا ہے۔یوں تو انسانی گروہ کے لیے قرآن پاک نے شعب ،فرقہ

---

(1) Political Ideas And Concepts, p-57

(2) الفرقان: 2، البقرۃ:102 (3) راغب اصفہانی،مفردات:61

یا فریق اور شیعہ کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، لیکن اس مفہوم میں قرآن مجید کے اندر کثرت سے استعمال ہونے والا لفظ قوم ہی ہے۔(1)

جہاں تک اس لفظ کے تاریخی پہلو کا تعلق ہے، کتاب الٰہی میں اس کا ذکر درج ذیل حوالوں سے آیا ہے۔

(۱) کسی خاص طرز فکر و عمل رکھنے والے گروہ کے لیے جیسے:

﴿لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ...... ، الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ...... ، الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ﴾(2)

(۲) کسی نبی کی امت اور کسی بادشاہ کی رعایا کے لیے، جیسے:

﴿مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ...... مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ......اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ﴾ (3)

(۳) کسی خاص علاقے میں رہنے والے انسانی گروہ کے لیے جیسے:

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝﴾

﴿فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ﴾

﴿وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ......﴾(4)

(۵) کسی خاص نسلی اور نظریاتی پس منظر، توارث اور تشخص کے حامل گروہ کے لیے قوم کے ساتھ ملت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے:۔

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا......﴾

﴿اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ......﴾۔(5)

(1) الحجرات:11، 13، البقرۃ:75، 85، الحجر:10
(2) الانعام:99، البقرۃ:264، (3) الاعراف:69، 127
(4) ہود:70، الاعراف:138، التوبۃ:17 (5) الحج:78، یوسف:37

(۶) کسی خاص عقیدے اور مسلک کے حامل گروہ انسانی کے لیے قوم کے ساتھ امۃ کا لفظ بھی آیا ہے:۔

﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰىٓ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾۔(1)

جبکہ امت کا لفظ اصلاً ایک مقدس فریضہ حیات کے ضمن میں استعمال کیا گیا ہے جیسے:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ......﴾

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ......﴾۔

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ......﴾(2)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن نے قوم کا لفظ یا تو ایسے انسانی گروہ کے لیے استعمال کیا۔

(۱) جو ایک خاص نقطہ نظر کا حامل ہو اور خاص ثقافت یا تہذیب رکھتا ہو۔

(۲) یا ایسی اجتماعیت کے لیے جو ایک دستور اور اقتدار و حکومت کے تحت ہو۔

(۳) یا ایسی جماعت انسانی کے لیے جو خاص علاقے میں رہائش پذیر ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی ایسی قوم کے لیے جو خاص نسلی توارث اور نظریاتی تشخص کی حامل ہو، قرآن نے ملت کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایسی ملت کو جو اپنے سامنے ایک فریضہ اور نظریاتی مقصدیت رکھتی ہو امت کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

قرآن میں لفظ قوم کے اس تاریخی حوالے کے ساتھ اب ہم اس نظریہ قومیت کا مطالعہ کریں گے۔ جو کلام الٰہی نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ:۔

---

(1) الاعراف:159، (2) البقرۃ:213، آل عمران:104، 110

(۱) پوری انسانیت ایک برداری اور مساوی انسانی رشتے میں مربوط ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَازَوْجَھَاوَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً......﴾۔(1)

(۲) نسل قبیلہ اور علاقے کی تخصیص صرف پہچان کے لیے ہے، عزت برتری اور تعصب کی بنیاد نہیں۔ تم اپنے والدین کے لحاظ سے ایک برادری ہو، تم میں سے معزز وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے:۔

﴿یٰٓاَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍوَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط......﴾(2)

(۳) قوموں اور گروہوں میں انسانیت کی تقسیم، اگر تکبر اور تعصب کی علامت بن جاتی ہے تو قابل مذمت ہے کیونکہ اس سے تمہارے درمیان دشمنی بڑھ جاتی ہے۔

﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ ط اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَo﴾(3)

تقسیم اور تفرقے کا یہ رویہ انسانی اجتماعیت کے لیے مفید نہیں ہے لہٰذا اس فرعونی اور طاغوتی طرز عمل سے بچے رہنا اور ایسے لوگوں کا ساتھ نہ دینا جو اس مرض میں مبتلا ہو جائیں، تا کہ اس منفی رجحان کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

﴿وَلَاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ط﴾

﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ط......﴾(4)

اسلامی تصور قومیت کے اس پس منظر کے ساتھ مغربی معاشروں میں دور جدید کی قومیت پرستی کا جائزہ لینا ضروری ہے، جو اس وقت جدید جمہوریت کا فکری و

---

(1) النساء:1، (2) الحجرات:13، (3) القصص:4
(4) الانعام:153، آل عمران:105

عملی حلیف ہے۔

قومیت دراصل اپنی اجتماعیت کے ساتھ لگاؤ، اپنے ملک سے وفاداری، اپنی تاریخ کے ساتھ منسلک رہنے کا شعور اور اپنے مشترکہ ورثے کے ساتھ وابستگی کے احساس کا نام ہے۔ یہ احساس اپنی شناخت، تعارف اور یکجہتی قائم رکھنے کے لیے بنیادی کردار ادا کرتا ہے، لیکن قومیت کا جذبہ ان حدود سے آگے بڑھ کر اپنے تحفظ کی بجائے اپنے تفوق اور برتری کے جنون میں تبدیل ہو جائے اور اپنے مفادات اور مقاصد کی تکمیل کی بجائے ہوس اور تکبر کا روپ دھار لے تو انسانی اجتماعیت آگ کا آلاؤ بن جاتی ہے، جہاں نفرت اور انارکی کا راج ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ عظیم میں بین الاقوامی سطح پر یہ بدامنی International Anarchy دیکھنے میں آئی تھی۔ (1)

بقول ہے وڈ (Heywood) قوم پرستی کی جدید تحریک یعنی Nationalism بظاہر انقلاب فرانس کی پیداوار تھی (2) مگر حقیقتاً اس کے بیج، یورپ میں صدیوں سے جاری، فکری کشمکش نے بوئے تھے۔ جن کی آبیاری تحریک اصلاح، نشاۃ ثانیہ اور جمہوریت کے ارتقاء نے کی تھی۔ پوپ اور بادشاہ کے درمیان جاری اقتدار کی کھینچا تانی، اس عوامی نقطہ نظر پر منتج ہوئی کہ اقتدار ان دونوں کا نہیں، بلکہ قوم کا ہے۔ لہٰذا جن کا حق ہے انہیں اس کے لئے متحرک اور منظم ہونا چاہیے۔ اس تحریک کی بنیاد کے لیے اتحاد و یگانگت اور ایک روحانی جذبہ کی ضرورت تھی، جو قومیت کے جنون کی صورت میں میسر آ گیا۔

یونانی علوم کی ترویجِ جدید، اپنے اندر قدیم یونانی قومیت پرستی کے جراثیم لئے ہوئے تھی۔ ان کی نشوونما کا کام نشاۃ ثانیہ کا یہ تصور کر رہا تھا کہ انسان اپنی حیثیت میں انفرادی سطح پر اہم ہے۔ وہ خود معیار خیر و شر ہے۔ وہ اپنے لیے مفید اور مضر کا فیصلہ

(1) Andrew Heywood, Political Ideas And Concepts, p-71
(2) Political Ideologies, p-152

خود کر سکتا ہے لہٰذا اسے اپنا مقدر خود بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔انسان خود اہم ہے۔ میں اہم ہوں۔ہم اہم ہیں۔یہ ''میں'' سے ''ہم'' تک کا سفر،قومیت پرستی کی ساری داستان ہے۔کسی ملک میں عوام خود اقتدار اعلیٰ کے مالک ہوتے ہیں لہٰذا قوم کو اپنے حاکم خود منتخب کرنے کا حق حاصل ہے:۔

The nation should be its own master.(1)

(قوم اپنا آقا خود ہوا کرے)

اس فکری بنیاد پر Self-government کی دیواریں استوار ہوئیں۔مطلق العنان حکومتوں کے خلاف ردعمل، یورپی اقوام میں تیزی سے بڑھتا گیا۔امریکی اعلان آزادی (۱۷۷۶ء) انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) اور نپولینی جنگیں (۱۷۹۲ تا ۱۸۱۵ء) جلتی پہ تیل کا کام کر گئیں جنہوں نے انیسویں صدی کو قومیت کے ارتقاء کی صدی بنا دیا:۔

The nineteenth century was a period of nation building.(2)

(انیسویں صدی دراصل قوموں کی تشکیل کا زمانہ ہے۔)

انیسویں صدی کے اختتام پر قومی پرچم،قومی ترانے، حب الوطنی کے نغمات،عوامی تقریبات،قومی تعطیلات کا نظام اور قومی زبان بطور ذریعہ تعلیم جیسے مظاہر دنیا بھر میں زور پکڑ گئے:۔

Such nationalism became increasingly chauvinistic and xenophobic.(3)

(اس طرح کی قومیت پرستی وجود میں آئی جو اپنوں کے لئے جنون تفوق اور غیروں کے لئے نفرت وتعصب سے بھرپور تھی۔)

---

(1) Heywood, Political Ideologies, p-153, (2) *Ibid*

(3) *Ibid*, p-154,

ہر قوم نے اپنی اعلیٰ صفات کے نعرے لگا کر اپنی سرحدوں سے باہر پھلانگنا شروع کر دیا اور یورپ نے نوآبادیاتی استعمار (Colonial Expansion) کی مہم جوئی شروع کر دی۔ کمزور قومیں زیر کر لی گئیں اور بیسویں صدی کے آغاز میں آدھی دنیا یورپی تسلط میں آ گئی اور اس صدی کے وسط تک کروڑوں انسانوں کو دو عظیم جنگوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا:

Nationalism was therefore a powerful factor leading to war in both 1914 and 1939.(1)

(لہٰذا قومیت پرستی کا جنون، دونوں عظیم جنگوں (1914 &1939) کا ایک زور آور جذبہ محرکہ تھا۔)

قوم پرستی کے زیرِ اثر، انسانیت کے خلاف ہونے والے...... اس تاریخی، بین الاقوامی جرم (Historical International Crime) کا حساب...... ابھی تک یورپ کے ذمے واجب الادا ہے۔

مذہب اور دستور و قانون

(Religion , Law & Constitution)

عربی زبان میں مذہب ذ ھ ب سے مصدر ہے، جس کے معنیٰ چلنا اور گزرنا کے ہیں۔ گویا، مذہب زندگی گزارنے کے طریقے، راستے اور اصول کو کہتے ہیں۔(2)

اردو زبان میں مذہب کے مترادف کے طور پر عقیدہ اور مسلک کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جب فقہ اسلامی میں مذہب سے مراد کسی مجتہد کا خاص مسلک ہوتا

(1) Heywood, Political Ideologies, p-154,

(2) لوئیس معلوف، المنجد: 238

ہے۔قرآن مجید میں مذہب کا لفظ تو مذکور نہیں، البتہ اس کے ہم معنی یا قریب قریب کے معنی رکھنے والے کئی الفاظ آئے ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیات سے واضح ہوتا ہے:

(1) ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَo﴾

(2) ﴿اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍo﴾

(3) ﴿وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ ......﴾

(4) ﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ......﴾

(5) ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ط......﴾(1)

ان آیات میں مذکور الفاظ:

صراط ، طريق، سبيل ، منسك،شريعه یاشرعه اور منهاج

کے مفاہیم، مفسرین کرام نے بالترتیب یہ بیان کئے ہیں:

راہ یا راستہ، راہِ عمل یا طریقۂ زندگی، راہِ بندگی یا دستورِ حیات۔(2)

قرآن مجید میں طریقۂ زندگی راہِ عمل اور ضابطۂ حیات کے لئے ایک اور لفظ الدین استعمال ہوا ہے جو مندرجہ بالا تمام الفاظ کا جامع ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ......﴾ (3)

اس آیت کریمہ میں قرآن حکیم نے یہ حقیقت بھی واضح فرمادی ہے، کہ اسلام صرف مذہب نہیں دین ہے اور یہی وہ دین ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ، مقبول اور مثالی ہوسکتا ہے اور کوئی نہیں! جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ......﴾۔(4)

---

(1) الفاتحہ:6، الاحقاف:30، الاعراف:146، الحج:67، المائدہ:48

(2) تفصیل کے لئے دیکھئے: سید مودودی، تفہیم القرآن:1/477، 2/79، 3/249

شاہ عبدالقادر ترجمۃ القرآن (مع فوائد موضح القرآن):2،105، 152، 305،353

(3) آل عمران:19، (4) آل عمران:85

لفظِ دین کے قرآنی مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہم یہاں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تشریح نقل کرتے ہیں، جس سے نہ صرف اس لفظ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم واضح ہوگا بلکہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں دین کی حیثیت اور مقام بھی مترشح ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے۔

(i) غلبہ وتسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔

(ii) اطاعت، تعبّد اور بندگی، صاحبِ اقتدار کے آگے جھک جانے والی کی طرف سے۔

(iii) قاعدہ ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

(iv) محاسبہ، فیصلہ اور جزا وسزا۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

دین ایک جامع اصطلاح ہے، اور" قرآن مجید اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی مراد لیتا ہے، جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت وفرمانبرداری قبول کر لے، اس کے حدود وضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت وخواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو "دین" کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔"(1)

یہ ہے لفظِ دین کی حقیقت اور اس کی اسلامی ریاست اور زندگی میں حیثیت۔

(1) سید مودودی، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات: 124، 132

انگریزی زبان میں لفظ مذہب کا متبادل Religion استعمال ہوتا ہے جو دراصل فرانسیسی Religiex اور لاطینی Riligio سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی عقیدہ، طریقہ عبادت اور مافوق الفطرت قوتوں کے خوف واطاعت سے منسلک ہیں۔(1)

جہاں تک انسانی اجتماعیت، ریاست اور قانون و معاشرت کے حوالوں سے مذہب کے لازوال تاریخی کردار کا تعلق ہے، اس سے تو آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید جمہوری نظام میں، مذہب کو وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں جو ہر انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے رہی ہے۔

اگر چہ قدیم مفکرین کی طرح، سیاسیات کے جدید ماہرین بھی مذہب کے سماجی کردار کی نفی نہیں کر سکے تاہم مذہب و سیاست کی دوئی اور مذہب کو انفرادی اور نجی معاملہ قرار دے کر، ریاستی نظام سے الگ کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے:

The impact of religion on political life has progressibly been restricted by the spread of liberal culture and ideas.(2)

(آزاد خیالی اور آزاد ثقافت کے پھیلتے ہوئے اثرات نے، مذہب کے سیاست پر اثرات کو، بزور روک دیا ہے)

اسی بنیاد پر جدید جمہوریت میں مذہب کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ جمہوری ارتقاء کی کہانی ہی مذہب و سیاست کی کشمکش سے بھرپور ہے۔ لہٰذا مذہب کو مشترکہ قیمتی اثاثہ یا میراث سمجھنے کے بجائے ہر فرد معاشرہ کا ذاتی اور نجی معاملہ قرار دیا گیا ہے۔(3)

مذہب کی نجکاری کے اس عمل (Privatization of Religion) نے اجتماعی سطح پر لامذہبیت (Secularism) اور انفرادی سطح پر، آزاد مشربی (Liberalism)

---

(1) Ronald Johnstone, Religion And Society, p-13.

(2) Heywood, Politicial Ideologies, p-295 (3) *Ibid*,p-296

کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔

لبرلزم کی تحریک کا آغاز، زور شور کے ساتھ تو انیسویں صدی سے ہوا مگر اسکی جڑیں چودہویں اور پندرہویں صدی کی نظریاتی تحریکوں (Reformation) میں مضمر تھیں۔ آغاز میں یہ تصور آزاد افراد معاشرہ کے لیے استعمال ہوا:۔

The term 'liberal' has been in use since the fourteenth century but has had a wide variety of meanings. The latin liber referred a class of free men, in other words, men who were neither serfs nor slaves.(1)

(لفظ آزاد منش، چودہویں صدی سے مستعمل ہے مگر اس کے کئی ایک مفاہیم ہیں۔ لاطینی میں یہ لفظ ایسے طبقے کے لئے بولا جاتا ہے جو (قدیم جاگیرداری نظام میں) نہ تو زرعی مزدور تھے اور نہ ہی غلام (بلکہ آزادی سے بہرہ ور تھے)

مغرب میں نئی روشنی کے عہد (Enlightenment) نے سائنس اور مذہب کے جس مخاصمے کا آغاز کیا اس کے نتیجے میں انفرادی آزادی کا سماجی انقلاب برپا ہوا جو کہ لبرلزم پر منتج ہوا:

Historically, the most important social influences on formation of liberal individualism were the wars of religion and rise of modern science in the sixteenth and seventeenth centuries, ...(2)

بطور سیاسی نظریہ کے لبرلزم کا وجود انیسویں صدی سے پہلے نہیں تھا۔ گویا یورپ میں جاگیرداری کے خاتمہ اور سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے قیام کے بعد، متوسط طبقہ عوام کی تمناؤں اور حسرتوں کا ابال، لبرلزم کی صورت میں نمودار ہوا۔ سترہویں صدی کا انگریزی اور اٹھارہویں صدی کے امریکی وفرانسیسی انقلاب اس کا زوردار محرک بنے اور یوں انیسویں صدی لبرلزم کی صدی قرار پائی۔

---

(1) Heywood, Political Ideologies, p-24

(2) Roger Eatwell, Contemporary Political Ideologies, p-24

The nineteenth century was in many ways the liberal century.(1)

جمہوریت اور لبرلزم دراصل جڑواں بہن بھائی ہیں، جنہوں نے جدید ریاست کے ہاں ولادت پائی ۔ ان دونوں میں اشتراک کی بنیاد، شہری آزادیاں(Civil Rights) یا بنیادی حقوق ہیں۔آغاز میں یہ ریاست سے انفرادی آزادی کے حصول کے لیے سرگرداں تھے اب یہ دیگر بنیادی حقوق کے طلبگار رہیں۔ درحقیقت یہ صنعتی مغرب کا تحفہ ہیں اور بنیادی طور پر مذہب و سیاست کی علیحدگی کا مقصد سامنے رکھتے ہیں۔جیسا کہ رچرڈ بلامی لکھتا ہے:۔

At the heart of liberal politics is a strict distinction between the state and civil society .(2)

(لبرل سیاسیات کی روح دراصل یہ ہے کہ مذہب اور جمہوری معاشرہ میں ایک اٹل حد بندی قائم ہو)

لبرلزم کی بگڑی ہوئی شکل سیکولرزم کا نام رکھتی ہے۔ بظاہر دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ یہ مذہب کے خلاف نہیں بلکہ یہ تحریک تو مذہب کو'مناسب' مقام دلاتی ہے:۔

Liberal secularism is by no means an anti-religius tendency.Rather it is concerned to establish a 'proper sphere and sole for religion.(3)

یہاں مذہب کے لئے مناسب کردار اور موزوں دائرہِ کار کا انتخاب کرنے سے مراد، فلپ ہیمنڈ (Philip Hammond) کے بقول یہ ہے کہ علم وحی کو نا قابل اعتماد ٹھہرایا جائے اور یوں تمام ریاستی اداروں پر مذہب کی فوقیت اور برتری ختم کردی جائے۔

Revelation is a distrusted source of knowledge... Religion has lost its presidency over institution...(this constitutes a process of secularization)(4)

(1) Andrew Heywood, Political Ideologies, p-25,
(2) Roger Eatwell, Contemporary Politial Ideologies, p-27
(3) Andrew Heywood, *Ibid*, p-295
(4) Philip Hammond, The Sacred In A Secular Age, p-36

اس کے برعکس اسلامی اصول سیاست میں ریاست اور معاشرہ کی تنظیم وتعمیر میں مذہبی عقائد کا بنیادی کردار ہے۔ ریاست وحکومت کا قیام ایک مذہبی فریضہ کے طور پر مسلمانوں پر لازم ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کا وجود ہی خلافت الٰہیہ کے قیام کے لیے ہوتا ہے۔ جس طرح کہ رسول آخرالزماں ﷺ نے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کرکے اس کا آغاز کیا تھا۔ اب مسلمانوں کی تاقیامت آنے والی حکومت دراصل رسول اللہ ﷺ کی نیابت وجانشینی ہوگی جسے خلافت کا نام دیا گیا ہے۔(1)

قرآن مجید نے اسی سلسلہ میں واضح طور پر اہلِ اسلام کو ہدایت کی ہے کہ وہ:

(۱) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور اس اطاعت کی روشنی میں اپنے اجتماعی معاملات کے ذمہ داران ''اولی الامر'' کی اطاعت کریں۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ ......﴾(2)

اور یہ کہ:

(۲) اگر وہ ان شرائط کے مطابق ایمان اور اعمال صالحہ کے لحاظ سے دنیا پر فوقیت رکھتے ہونگے تو اللہ انہیں زمین کی حاکمیت عطا کرے گا۔

﴿وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنكُمْ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ ......﴾(3)

اور اس طرح:۔

(۳) جب بھی مسلمانوں کو تمکن فی الارض ملے گا تو وہ دین اسلام کی سربلندی اور اس کی تنفیذ میں سرگرم عمل ہوجائیں گے!

﴿ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّـٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟

(۱) الماوردی، الاحکام السلطانیہ: ۵، مقدمہ ابن خلدون: ص 371

(2) النساء: 59 (3) النور: 55،

الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط......﴾(1)

ان بنیادوں کے لحاظ سے جمہوریت اور خلافت اسلامی باہم متضاد انتہاؤں پہ قائم ہونے والے نظام ہائے حکومت ہیں۔ جمہوری فکر میں ریاست اور حاکمیت کا قیام انسان کی ضرورت ہے تا کہ نبیادی حقوق کا تحفظ ہو سکے جبکہ اسلامی اصول سیاست میں اس کا قیام رسولوں کے ذریعے، واجب قرار دیا گیا ہے تا کہ اللہ کا دیا ہوا نظام حیات قائم ودائم ہو اور انسانی معاشرے عدل پر قائم ہو جائیں:۔

﴿هُوَالَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ..........﴾ (2)

﴿لَقَدْاَرْ سَلْنَارُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج......﴾(3)

اسی بنا پر رسول خدا نے اسلامی ریاست وحکومت کو اللہ کی رحمت قرار دیا تھا۔ اور اسی حکمت کے پیش نظر مسلمان سیاسی مفکرین اسلامی ریاست وحاکمیت کا قیام پوری انسانیت کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور اسے اسلامی فرائض کا اہم حصہ مانتے ہیں۔مثال کے طور پر امام ابن تیمیہؒ کی رائے نقل کی جاتی ہے:۔

ان ولاية امرالناس من اعظم واجبات الدين بل لاقيام للذين الابها۔(4)

جمہوری نظام نے دستور سازی کا اختیار عوامی نمائندگان پر مشتمل پارلیمنٹ کو دیا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کی خواہشات اور مفادات کی مطابقت میں ہو...... دستور، عوامی فلاح و بہبود، معاشی وسماجی انصاف اور امن وامان، بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہو تا کہ عوام کے اقتدار اعلیٰ کا عملی

(1) الحج:41 (2) الصف:9، (3) الحدید:25 (4) ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیہ:161

اظہار ہو سکے اور وہ مقصد پورا ہو، جس کے لئے عوام اپنی حکومت منتخب کرتے ہیں۔(1)

اسلامی تعلیمات کے مطابق، بنیادی محکم اصول جو کہ نا قابل تبدیل و تنسیخ ہیں، قرآن مجید کی صورت میں، اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ ہیں۔ انسانی عقل محدود ہونے اور خواہشات کا غلام ہونے کی بنیاد پر ایسا دائمی و ہمہ گیر قانون نہیں بنا سکتی جو آفاقی خصوصیات رکھتا ہو اور ہر طبقے کے تمام انسانی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ضامن بن سکے، اس لیے بنیادی اصول کتاب الٰہی اور سنت رسول ﷺ کے ذریعے واضح کر دیئے گئے۔ جن کی عملی صورت رسول خدا ﷺ نے خود ایک ریاست میں قائم کر کے پیش کر دی ہے لہٰذا اب انسانوں کو اس قانون کی صرف جزیات وفروعات میں تبدیلی کا حق، وقت کے تقاضوں کی روشنی میں بنیادی اصول و حدود کے اندر رہتے ہوئے، (مجتہدین کے اجماع و قیاس اور اہل حل و عقد کے انتظامی اختیارات کی صورت میں) حاصل ہے۔(2) سیاسی وسماجی امور میں عدل وانصاف اور مشاورت وشوریٰ کے اصولوں پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔(3) ساتھ ہی یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے والا معاشرہ، اپنے لیے ظلم، فسق اور کفر کا راستہ منتخب کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾

﴿......فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

﴿......فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (4)

---

(1) Soltau, An Introduction To Politics, p-84, 87

(2) تفصیل کے لئے دیکھئے: سید مودودی، اسلامی ریاست: 464 تا 470

(3) آل عمران: 159، الحج: 41 (4) المائدہ: 44 تا 47

پارلیمنٹ، ووٹ اور کثرت رائے کا اصول
(Parliament, Vote & Majority Principle)

دورِ قدیم سے، سربراہ حکومت کے ساتھ ساتھ نظام مملکت کو چلانے کے ذمہ دار افراد کا ایک ادارہ موجود رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے قدیم بادشاہوں کے ذکر میں ایسے ادارے یا مجلس کو ''ملاء قوم'' کے نام سے یاد کیا ہے (1) ایران کی قدیم سلطنت میں اس کا نام مجلس بزرگان (Elders Council) تھا اور یونان میں مجلس پنج صد کے نام سے اس کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ (2) آج کے دور میں یہی ادارہ پارلیمنٹ (Parliament) کہلاتا ہے۔ سرزمینِ عرب میں مکہ، اور یونان کی قدیم شہری ریاستوں میں یہ ادارہ بالترتیب ''دار الندوہ'' اور ''ھیلیا'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یونانیوں اور عربوں نے اپنی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے افراد کی اہلیت، عمر اور ان کے اختیارات کا پورا نظام، وضع کر رکھا تھا۔ (3)

نظام جمہوریت نے اپنا کوئی نیا ادارہ متعارف نہیں کروایا بلکہ اسی قدیم روایتی ایوان ہی کو اپنا لیا ہے۔ جمہوری فکر میں اقتدار کا اصل مالک عوام کو مانا گیا ہے۔ جدید دور میں آبادیوں کی کثرت نے عوام کی، اقتدار میں براہ راست شرکت کو ناممکن بنا دیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک ایوان نمائندگان ہو جس میں لوگوں کے منتخب نمائندے عوامی مفادات کے مطابق ان کے دیئے گئے حق اقتدار کو استعمال کر سکیں۔ یہ ایک مشاورتی ادارہ ہو جس میں قانون سازی ممکن ہو سکے۔ (4)

---

(1) النمل: 29 تا 32 (2) ابن جریر، تاریخ طبری: 2/232،

(3) سید سلیمان ندوی، تاریخ الارض القرآن: 2/106

(4) See for details: Soltau, An Introduction To Politics, p-179

مغرب میں پارلیمنٹ(Parliament) اور(Assemblies) کو عوام کی حاکمیت کی عملی صورت گردانا گیا ہے۔ لہٰذا اسے ہر طرح کے دستور و قانون کی تخلیق، تجویز اور ترمیم کا حق حاصل ہے۔ خلافت اسلامی کے عہد میں یہ ایوان مشاورت، ایک نمائندہ اہل الرائے کا ادارہ تھا جہاں مسلمانوں کی اہم شخصیات جمع ہو کر خلیفہ کو مشورہ دیتیں۔ حضرت عمر فاروقؓ (خلیفہ دوم) نے اس مشاورتی ادارے کو وسیع کیا اور اس کے اجلاسوں کی تعداد بڑھائی۔ (1)

پارلیمنٹ کے حوالے سے ایک اہم پہلو جو جدید جمہوریت کی بنیادوں میں سے ہے اور اسلامی اصول سیاست سے جزوی مطابقت رکھتا ہے وہ نظام شورائیت ہے۔ پارلیمنٹ یا نمائندہ اسمبلی بحث و تمحیص کے نتیجے میں عوام الناس یا رعایا کے لیے بہتر سے بہتر فیصلہ، ان کے نمائندوں کی آراء کی بنیاد پر کرتی ہے، یہ پہلو اسلامی اصول سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ قرآن نے اہل اسلام کے امور کو مشاورت کے ساتھ طے پانے کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور رسول خدا ﷺ کو ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے) کی تاکید کی ہے (2) اسی بنیاد پر یہ اسلامی حکومت کے دستور کی لازمی شق ہے اور اسلامی تاریخ کا طرۂ امتیاز بھی!

تاہم مشاورت کے اصول، مقاصد اور طریقۂ کار ایسی چیزوں میں جمہوری سیاست اور اسلامی تعلیمات میں بہت فرق ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق کسی ہیئت حاکمہ کو، وہ ایک فرد پر مشتمل ہو یا کئی افراد پر، قرآن و سنت کے فراہم کردہ دستور و قانون میں ترمیم کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کا پورا اختیار انہیں حاصل ہے اور تمام نزاعی امور میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے رجوع کا حکم ہے:

---

(1) تفصیل کے لئے دیکھئے: البلاذری، فتوح البلدان: 276

(2) آل عمران: 159

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ......﴾(1)

پارلیمنٹ کے ممبران یا عوامی نمائندگان کے سلسلہ میں بھی جمہوری اصول اور اسلامی طریق مختلف ہیں۔ جمہوری نمائندہ ایوان، عوام کی اکثریت (انتخابی طریق کار کے مطابق) کی حمایت کے حامل افراد پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں کسی کے کردار اور اہلیت کو بنیاد نہیں بنایا جاتا۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے ساتھ زیادہ لوگ ہیں بلکہ کس نے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ کرلیا ہے، جبکہ اسلامی شوریٰ میں رکنیت کی کچھ خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ جن میں قابلیت و اہلیت، دیانت و امانت اور اخلاق، کردار کی اعلیٰ صفات کو لازم قرار دیا گیا ہے۔(2) عوامی اکثریت کی حمایت کوئی بنیادی شرط اہلیت کے طور پر نہیں رکھی گئی تاہم یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ایسے افراد نمایاں اور نمائندہ کردار و حیثیت کے مالک ہوں اور درج بالا صفات کے حامل بھی۔ ایسے عوامی نمائندے جن کے ذمے محلے یا اپنے علاقے کے معاملات کی ذمہ داری ہوتی اور خلیفہ انہیں اپنی مشاورت میں شریک کرتے حدیث کی زبان میں 'العرفا' کہلاتے تھے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:۔

ان العرافه حق ولا بد للناس من العرفاء (3)

عرفاء دراصل عریف کی جمع ہے۔ یہ لفظ......مدبر، منتظم اور سردار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(4)

قرآن مجید نے یوں تو عوامی نمائندگان کے لیے ''نقیب'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے حوالے سے کہا گیا:

---

(1) النساء:59، (2) الماوردی، احکام السلطانیہ: 35، گوہر الرحمٰن، اسلامی سیاست:300

(3) سنن ابوداؤد:3/248، (4) ابن منظور، لسان العرب:9/238،

﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ط﴾(1)

اور رسول کریم ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ سے پہلے بیعت عقبہ کے موقع پر نقبا (نقیب کی جمع) مقرر کیے تھے۔(2) کسی ریاست کی با اختیار ہیئت حاکمہ کے لیے قرآن نے دو تراکیب استعمال کی ہیں:

(۱) ایک تو ملاء القوم جو کہ فرعون مصر اور ملکہ سبا کے ذکر میں آیا ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيْمٌ O﴾ اور

﴿ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ج...... ﴾

(۲) دوسرا اولی الامر جو کہ خاص طور پر مسلمانوں کے حکام کے لیے استعمال ہوا ہے:

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج......﴾(3)

اولی الامر سے مراد قوم کے وہ ذی عقل اور ذی رائے لوگ ہوتے ہیں جو صلاحیت اور اہلیت کی بنیاد پر عوام الناس کے اجتماعی امور کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں۔(4)

اسی بنیاد پر امام فخر الدین رازی اور الماوردی نے ایسے افراد کو اھل حل والعقد کہا ہے۔(5)

جدید جمہوریت عوام کی حاکمیت کو عمل میں لانے کے لیے قوم کے نمائندوں کے چناؤ میں اور ایوان نمائندگان کے اندر مختلف فیصلوں میں کثرت رائے کا اصول اپناتی ہے۔ جمہوری معاشرے میں فرد ایک ووٹ رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام افراد

---

(1) المائدہ:12، (2) سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ﷺ: 1/265،

(3) الاعراف:109، النمل:32، النساء:59، 83،

(4) القرطبی، الجامع لاحکام القرآن:5/260

(5) الرازی، فخر الدین، تفسیر الکبیر:10/144، الماوردی، الاحکام السلطانیہ:6

یکساں اور مساوی ہیں۔ جس رائے کے حق میں ووٹوں کی اکثریت ہو جائے وہ فیصلہ بن کر نافذ ہو جائے گا اور جو فیصلہ زیادہ لوگوں کی حمایت نہیں رکھتا، وہ نہیں اپنایا جائے گا۔ جمہوری ریاست کا بنیادی مقصد عوام کی حاکمیت کا قیام ہے اور وہ اسی طریقے میں عمل میں آسکتی ہے۔(1)

اس سلسلہ میں قرآنِ مجید کی تعلیمات حکمت کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

(1) شعور و بصیرت کے لحاظ سے تمام انسان مختلف اہلیت و صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں اور باشعور اور جاہل آپس میں برابر نہیں ہوتے جس طرح اندھا اور صاحب بصیرت ایک جیسے نہیں ہو سکتے:۔

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ......﴾
﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝﴾(2)

(2) اسی طرح پاک چیز ناپاک کے برابر نہیں ہوسکتی۔ بے شک وہ متاثر کن ہو۔...... گویا پاکباز لوگوں کی آراء اور فیصلوں کو ترجیح حاصل ہے۔

﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ......﴾(3)

(3) انسانوں کی اکثریت عموماً اپنے فیصلے خواہشات اور جذبات کے تحت کرتی ہے۔ اس طرح کے فیصلے جہالت، شرک، فسق اور ظلم کا باعث بنتے ہیں۔ لہٰذا اس اصول کو اپنانا درست نہیں اور نہ ہی مفید ہے۔ اکثریت کا عموعی رویہ، اللہ کے راستے سے ہٹا ہوا اور ایمان اور تشکر کے اصولوں سے عاری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی پیروی گمراہی کے راستوں پر لے جاتی ہے:۔

---

(1) تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ 137 تا 138،

(2) الزمر:9، الانعام:50، (3) المائدہ:100

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ (1)

ان اصولوں میں جہاں عوامی اکثریت کی رائے پر اہم فیصلے کرنے سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے وہاں صائب الرائے اور صاحب بصیرت اور اچھے کردار کے مالک، افراد معاشرہ سے رائے لینے کی ترغیب دی گئی اور تاکید کی گئی ہے۔ رسول خدا ﷺ کے اپنی قائم کردہ ریاست اور آپ کے تیار کردہ خلفاء نے اسلامی ریاست وحکومت کے نظام کو انہیں اصول وضوابط کی روشنی میں چلایا، تاریخ اس کی شاہد ہے۔ (2)

تاہم یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درج بالا حوالوں سے، آیا عام انسانوں کی مجرد اکثریت ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہے یا اس اصول کا اطلاق اہل ایمان کے سواد اعظم اور جمہور مسلمانوں پر بھی ہوگا؟ اور دوسرا یہ کہ کثرت رائے پر فیصلے کرنے کا اصول، صرف انتخاب کے عمل میں ممنوع قرار پاتا ہے یا کسی نمائندہ ایوان میں فیصلوں کے حوالے سے بھی؟

جہاں تک سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو بنظر عمیق جائزے سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہاں عوام الناس کے عمومی رویے کا مزاج بتایا گیا ہے اور زندگی کے اہم فیصلوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مقابلے میں عوامی رائے کے رحم وکرم پر چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے۔ جہاں تک ایمان لانے والوں اور اپنے آپ کو اعمال صالحہ سے مزین کر لینے والے لوگوں کا تعلق ہے تو ایسے انسان اللہ کی نظر میں عوام الناس سے ممیّز اور ممتاز ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو قرآن مجید نے قابل قدر ناموں سے پکارا ہے۔ اور صادقین، متقین، خسارے سے پاک، خوف وحزن سے محفوظ اور اہل بصیرت قرار دیا ہے۔ (3)

---

(1) الانعام:116 (2) ابن ہشام:230، ابن جریر:2/273

(3) الحدید:19، البقرۃ:4تا10، الاعراف:35

جہاں تک کسی ایوان میں ریاستی اور اجتماعی فیصلوں کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں برابر وزن کے دلائل و آراء کی صورت میں، مختلف فیہ مسائل میں کثرت رائے کا اصول اپنانے کے علاوہ چارۂ کار نہیں ہے۔ تاریخ اور فقہ اسلامی کی کتب میں موجود قال الجمھور کے الفاظ سے اس پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ اہل بصیرت اور اہل الرائے کی نمایاں اکثریت کو ہی جمہور کہا گیا ہے، جو کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم بھی ہے۔(1)

قانون سازی میں مسلمانوں کی اکثریت کی تائید یا مفاد کا خیال رکھنا تو ضروری سمجھا گیا ہے مگر کسی فیصلے کی بنیاد محض اس بات کو نہیں بنایا گیا کہ اسے عوامی اکثریت کی حمایت حاصل ہے لہٰذا اسی کو قانون بنالیا جائے بلکہ اس بات کا اختیار خلیفہ وقت (سربراہ مملکت) کو دیا گیا ہے کہ وہ مناسب فیصلہ خود کرے۔(2)

اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں خلیفہ یا عمال حکومت کے براہ راست (جمہوری طریق کے مطابق) انتخاب کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جس سے اس سلسلہ میں کسی انتخابی اصول کی وضاحت ہوتی ہو، تاہم بیعت عامہ کے ذریعے مسلمانوں کی اکثریت کی تائید کا نظام موجود ہے۔(3) لہٰذا دورِ جدید میں ایسا طریق کار وضع کیا جا سکتا ہے جو اسلام کے مجموعی نظام کی مناسبت سے درست بھی ہو اور حالات و ضروریات سے مطابقت بھی رکھتا ہو!

خلیفۂ وقت کی طرف سے عمال حکومت اور خود آئندہ خلیفہ کی نامزدگی کی مثالیں موجود ہیں تاہم ایسی نامزدگی کے ساتھ عام مسلمانوں کی رضا کارانہ تائید کو ضروری سمجھا گیا۔(4) جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کی خلافت کے سلسلہ میں ہوا اور آپؓ نے عمال کی تبدیلیاں عام مسلمانوں کی رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے کیں۔(5)

---

(1) الماوردی، الاحکام السلطانیہ:6، ابن منظور، لسان العرب:4/149

(2) تفصیل کے لیے دیکھئے: تاریخ ابن کثیر:8/1180 تا 1190

(3) ابن اثیر، الکامل:2/35 تا 37

(4) تفصیل کے لئے دیکھئے: تاریخ ابن کثیر:7/147، (5) ابن اثیر، الکامل:2/418

خلافت اسلامی نے مسلم اکثریت کی رائے اور تائید کے حصول کے لیے ایک منفرد نوعیت کا ادارہ تشکیل دیا جو''بیعت'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اس رضا کارانہ معاہدہ کا نام ہے جو حاکم ومحکوم کے درمیان اس بنیاد پر قرار پاتا ہے کہ حاکم اللہ کے دین کو نافذ کرے گا اور محکوم اسے تسلیم کرے گا۔ خلافت کے انعقاد میں یہ شرط لازم ہے اور اس کے بغیر کوئی فرد خلیفہ قرار ہی نہیں پا سکتا۔(1)

جدید جمہوری نظام میں ووٹ کے طریق کار کو عوام الناس کی رضامندی کے حوالے سے''بیعت'' کے ادارہ سے مشابہت دی جاتی ہے مگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مقاصد اور طریق کار میں بڑا بنیادی فرق ہے۔

جمہوری ریاست میں ہر شہری اقتدار کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ کسی دوسرے فرد یعنی نمائندے کو وہ اقتدار کا اپنا حصہ ووٹ کی صورت میں دیتا ہے تا کہ وہ منتخب ہونے والا نمائندہ اس کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اس چیز کو وہ اپنا''حق'' سمجھتا ہے اور خالص اپنی مرضی سے اس کا فیصلہ کرتا ہے......(2)

اگرچہ دور جدید میں یہ بات محلِ نظر ہے کہ آیا کہ وہ اس کی''اپنی'' مرضی ہوتی ہے یا اپنی خواہشات کی مجبوری، جسے موجودہ دور میں انتخاب کے نظام، ذرائع ابلاغ کے پراپیگنڈے اور جذباتی، معاشی بلیک میلنگ کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

نظام خلافت میں بیعت کرنے والے کا تصور اس سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنا حق نہیں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اقتدار کو اپنی ملکیت نہیں اللہ کی ملکیت اور اپنے پاس امانت سمجھتا ہے۔ تمام شہری اپنی اس امانت کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کرنے کا عہد لیتے ہوئے سربراہ مملکت یعنی''خلیفہ'' کے ہاتھ سونپتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔

---

(1) الفتح:10، راغب اصفہانی، مفردات:134

(2) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-76

اسلامی اصول سیاست میں خلیفہ اور رعایا کا تعلق اطاعت فی المعروف اور تعاون علی البر کی بنیاد پر بیعت کے ذریعے استوار ہوتا ہے جبکہ جمہوری ریاست میں ووٹ دینے والے اور لینے والے کا تعلق ایک محسن اور ممنون کا ہوتا ہے، اطاعت وغیرہ کا کوئی تصور کارفرمانہیں ہوتا۔ ووٹ کا تعلق دنیا کی سیاست اور مفادات تک محدود ہوتا ہے جب کہ بیعت دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی سے وابستہ ہے۔

ان دونوں کے طریق کار میں ایک اور نمایاں فرق ہے کہ ووٹ مانگا جاتا ہے اور ووٹ لینے والا اپنے آپ کو نمائندگی کے لیے خود پیش کرتا ہے جبکہ خلافت کی بیعت میں یہ دونوں عناصر نہ صرف یہ کہ شامل نہیں ہوتے بلکہ ممنوع ہوتے ہیں۔(1) اس کے ساتھ بیعت کا معاہدہ، سرعام، علی الاعلان ہوتا ہے جبکہ ووٹ خفیہ رائے دہی کے اصول پر دیا جاتا ہے، ان حوالوں سے دیکھا جائے تو ان دونوں کے اصول ومقاصد، طریقِ کار اور اثرات ومضمرات (Implications) کے لحاظ سے زمین وآسمان کا فرق ہے۔

بنیادی حقوق کا فلسفہ اور اس کا اسلامی تناظر

جدید جمہوری نظام میں، حکومت وسیاست کا یہ طرۂ امتیاز بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے انسانی معاشروں کو آزادی ومساوات کا تحفہ اور بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہوا ہے۔ اور یہ کہ معاشرے میں فرد کی اہمیت اور اس کے حقوق کی نگہداشت کی ضمانت جمہوریت میں ہی ملتی ہے۔ جدید ماہرین سیاسیات میں ایک معتبر نام ایچ جے لاسکی (H. J. Laski) کا ہے۔ جمہوریت کے درج بالا دعوے کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

Democracy rests on a belief in the fundamenal dignity and importance of the individual , in the essential equality of human beings, and in the need for freedom.(2)

(1) An Introducdtion To Politics, p-48

(2) Modern Forms Of Government, p-199

اس سے معلوم یہ ہوا کہ موجودہ جمہوریت کی بنیاد فرد کی اہمیت و عظمت پر ہے۔ اور کسی حکومت کے لیے آج کے دور میں یہ اقدار ایک آزمائشی پیمانہ Test Case اور Touch Stone کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہیں اصول و اقدار کی پاسداری اور ان کو عروج تک پہنچانے کی صورت میں کوئی حکومت مثالی حکومت بن سکتی ہے۔

میخائل سٹیورٹ (Michael Stewart) اس فلسفے کی عملی تشریح یوں کرتا ہے:۔

When people claim that their country is a democracy We understand them to say that, as for as is humanly possible, all the adult citizens have an equal opportunity to exercise political power.(1)

(جب کسی ملک کے لوگ ایک جمہوری ریاست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ...... جہاں تک انسانی سطح پر ممکن ہے...... تمام بالغ شہریوں کو یکساں موقع میسر ہے کہ وہ اپنی حاکمیت کا حق استعمال کریں۔)

یعنی اس کے خیال میں تمام شہریوں کو عملاً سیاسی (حق کے استعمال کی) قوت، یکساں اور مساوی طور پر حاصل ہو، تو جمہوریت روبہ عمل ہو گی، وگرنہ نہیں۔ فلسفہ جمہوریت کی اس روح کا فکری پس منظر کیا ہے؟ سالٹاؤ (Soltau) نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

At the foundation lies a spiritual concept, that all men are equally children of god and there by equal in their needs and their rights. (2)

(بنیاد میں یہ روحانی اصول کارفرما ہے کہ تمام انسان یکساں طور پر خدا کی اولاد ہیں اور اس بنیاد پر اپنی ضروریات اور اپنے حقوق کے لحاظ سے برابر ہیں۔)

حقوق اور ضروریات کی مساوات میں فرد کی آزادی کا راز پنہاں ہے۔ اس

(1), (2) Soltau, An Introduction To Politics, p-166

کے خیال میں ریاست کا کام صرف ان حقوق کا تحفظ ہے۔اس معیار کے مطابق جس طرح کہ لوگ خود چاہیں۔لہٰذا وہ لکھتا ہے کہ:

The state is only there to give individuals their fullest, opportunity of living a good life, they, not the state being the judge of what 'goodness is for them. And finally authority cannot come from above or from outside; its only source is the people themselves; its only justification is its derivation from popular authority.(1)

(ریاست، دراصل افراد معاشرہ کو ایک اچھی زندگی گزارنے کے مکمل مواقع فراہم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔اور یہ کہ اپنے لئے ''اچھائی'' کا فیصلہ کرنے کا اختیار، ریاست کو نہیں، خود افراد کو حاصل ہوتا ہے۔اور آخری نقطہ یہ ہے کہ اختیار حاکمیت کا بنیادی سرچشمہ لوگ خود ہوتے ہیں، یہ کہیں عالم بالا یا عالمِ خارجی سے وارد نہیں ہوسکتا۔)

سیاسی ماہرین کی درج بالا آراء سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمہوری ریاست میں افراد کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ آزادی اور مساوات کی بنیادوں پر مہیا ہوتا ہے۔فرد کی اہمیت وعظمت کو معیار بنا کر تمام لوگوں کو آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے حقوق مساوی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔وہ اپنے حقوق کے تعین اور ان کے حصول کے لئے سیاسی حاکمیت میں شرکت کے یکساں مواقع سے بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔

ذیل میں بنیادی حقوقِ انسانی کے اس فلسفے کا محاکمہ، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے گا، مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آزادی اور مساوات کے تصورات کا تجزیہ کیا جائے۔

جمہوری فکر کے مطابق آزادی یہ ہے کہ آدمی اپنی مرضی کا مالک ہو، اپنی قسمت اور مستقبل کا معمار اور اپنی خواہشات پورا کرنے کا حق رکھتا ہو اور اس حق

(1) Soltau, *Ibid*, p-166

میں سب برابر ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اپنی مرضی کے مطابق چلنا اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گذارنا، واقعی آزادی ہے؟......بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات منطقی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے تابع ہو کر رہنا، آزادی نہیں درحقیقت اپنی خواہشات کی غلامی ہے۔ ایسے آزاد بندوں کا معاشرہ جو اپنی مرضی اور خواہش کے بندے ہوں، دراصل غلاموں کا معاشرہ ہوتا ہے۔

یہی الجھن ہے جس کی بنیاد پر خود مغرب کا مفکر پریشان ہو جاتا ہے:۔

Freedom is difficult to discuss .... Perhaps the best way of giving shape to freedom is by distinguishing it from 'Unfreedom'.(1)

الجھن یہ ہے کہ جب حقوق کے لحاظ سے برابری کا عمل شروع ہوتو ایک فرد کے حقوق کی آزادی دوسرے فرد کے حقوق کی بندش کی ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایک کی آزادی، دوسرے کو مجبوری کی غلامی تک دھکیل سکتی ہے!۔

In this sense, freedom is a zero- sum game: When one person, an employer, gains more freedom, someone else, an employee, loses it.(2)

یہی وجہ ہے کہ خود مغرب میں یہ تصوراتی الجھن، میدان عمل میں، محض تصوراتی حقیقت بن کے رہ جاتی ہے:۔

Equality of opportunity points towards an inegalititarian ideal....(3)

اسی طرح مطلق مساوات میں بڑا ابہام ہے۔ مساوات کس لحاظ سے؟ حجم یا اہمیت (Size or Value) کے لحاظ سے، حالات کی یا صلاحیتوں کی مساوات، مقاصد کی یا کامیابیوں کی؟

Equality is a highly complex concept, there being as many forms of equality as there are ways of comparing the condition of human existence.(4)

---

(1) Ortega Y. Gasset, The Revolt Of The Masses, p-191,

(2) ***Ibid***,p-199 (3) ***Ibid***, p-231, (4) ***Ibid***, p-226

تصورات چونکہ ایک دوسرے میں ناقابل تفریق حد تک مدغم ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کی تشریح، تحدید اور تعریف ناممکن ہو جاتی ہے۔جس طرح ڈکسن (Dixon) کہتا ہے:۔

Abstract concepts have overlapping boundories and are sometimes ambiguous and relatively indeterminate.(1)

پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کی آزادی پر سے ساری پابندیاں ہٹاتے جائیں تو دوسروں کے کئی دوسرے حقوق پر پردے پڑتے جاتے ہیں۔معاشی آزادی اسی طرح کی ایک الجھن ہے، کہ دولتمند اور غربت کے مارے کو اگر ایک جیسی آزادی دی جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟

...since advocates of that particular doctrine suppress, or, at least, fail to notice, the hidden 'unfreedoms' which are associated with it.(2)

گویا آزادی و مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کا جو تصور جمہوری فکر میں دیا گیا ہے اس سے بعض انفرادی مسائل تو حل ہو جاتے ہیں، مگر ساتھ ہی بہت سے اجتماعی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے اسلامی اصول سیاست سے یہ جمہوری اقدار متضاد اور مخالف رخ اختیار کر لیتی ہیں۔مثال کے طور پر مساوات کے اصول کے تحت جمہوریت نے مرد اور عورت کو ایک میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔اسلامی تعلیمات نے دونوں کے الگ دائرہ کار، الگ صلاحیتوں اور الگ جسمانی اور نفسیاتی کیفیات کی بنیاد پر، ان کے الگ الگ حقوق اور فرائض کی تفصیلات دی ہیں۔جن حوالوں سے دونوں یکساں ہیں وہاں ان کے درمیان مساوات بیان کی گئی ہے (مثلاً اعمال کے بدلے اور جزاء کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں)۔اسی طرح جہاں وہ غیر مساوی ہیں وہاں الگ الگ حقوق و فرائض

(1) Dixon, Freedom And Equality, p-19 (2) *Ibid*, p-29

بیان کیے گئے ہیں (عائلی اور معاشرتی زندگی اس کی مثال ہے)۔

اسلام میں انسان ان معنوں میں آزاد نہیں ہے جن معنوں میں مغربی جمہوریت اسے آزاد قرار دیتی ہے۔

قرآن مجید نے آزاد آدمی کے لئے "حرٌ" اور غلام کے لئے "عبدٌ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قانونِ قصاص کے بیان میں ارشاد ہوتا ہے:

"﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ......﴾ (1)

امام راغب اصفہانی کے مطابق: الحر، العبد کی ضد ہے۔ یعنی ایسا انسان جو کسی اور کی غلامی میں نہ ہو (2)۔ اس مفہوم کے تحت غلامی سے آزادی تک عمل کے لئے قرآن پاک نے "تحریر رقبه" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (3)

ایک لطیف نقطہ یہ ہے کہ اسی لفظ حر کے مادے سے ترکیب پانے والا لفظ "محررا" قرآن مجید میں ایک اور معنی میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ......﴾ (4)

یہاں محررا کا لفظ مفسرین اور اہل لغت کے نزدیک وقف شدہ، خادم معبد اور مخلص تابع فرمان انسان کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (5) گویا قرآن وسنت کے بیان کردہ فکری و عملی اصولوں کے مطابق انسان آزاد بھی ہے اور غلام بھی۔ آزاد ان معنوں میں کہ وہ کسی انسان یا دیگر ہستی کا غلام نہیں مگر وہ غلام ان معنوں میں ہے کہ اپنے رب کا عبد ہے:۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (6)

---

(1) البقرۃ:178، (2) المفردات:111، (3) النساء:92 (4) آل عمران:35

(5) المفردات: ایضاً، سید مودودی، تفہیم القرآن:1/247 (6) الذاریات:56

اسی طرح کا معاملہ مساوات کے ساتھ بھی ہے۔انسان کچھ حوالوں سے برابر ہے جیسے تخلیق، انسانیت، تکریم وغیرہ۔اسی طرح کچھ حوالوں سے غیر مساوی ہے جیسے درجات، اہلیت، علم، رزق وغیرہ۔خود مرد وعورت ہی کی مثال کو لیجیے، قرآن فرماتا ہے:۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾(1)

بیسویں صدی میں جدید افکار کے انقلاب سے پہلے، فطری حقوق (Natural Rights) کے نام سے مذہب عیسائیت کے منظم کردہ حقوق کا ایک سلسلہ موجود تھا۔مذہبی تفوق کو جوں جوں زوال ہوا، توں توں ان ''فطری حقوق'' کی مذہبی اور اخلاقی حیثیت تبدیل ہوتی گئی:

By the twentieth century, the decline of religious belief had led to the secularisation of natural right theories, which were reborn in the form of 'human' rights(2)

انسانی حقوق کی اس تحریک کے پیچھے بنیادی طور پر نشاۃ ثانیہ کے اس تصور کو دخل تھا، جس کے تحت زندگی کے تمام معاملات کو صرف انسانی سطح پر پرکھنے کی سوچ پروان چڑھی۔بیسویں صدی میں ان حقوق کی درج ذیل تعریف کی گئی۔

Human rights are rights to which people are entitled by virtue of being human.They are therefore,'Universal' rights in the sense that they belong to all human beings.... Human rights are also fundamental' rights in that they are inalienable, they can not be traded away or revoked.(3)

بنیادی انسانی حقوق کی یہ سادہ سی تعریف ہے۔اس کی تشریح میں بہت

(1) البقرۃ:228

(1) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-141

(2) *Ibid*, p-142

وسعت آئی ہے اور خود مغرب میں اس پر بہت بحث کی گئی ہے، جو کہ بنیادی حقوق کے دائروں پر سے قدرتی اور مذہبی اصولوں کو ہٹانے سے متعلق ہے اور خود اس اصطلاح کے اطلاق اور تعین سے منسلک ہے۔

اگر انسانی حقوق کے اس تصور کو سامنے رکھا جائے جو انہیں ...... بنیادی ...... عالمگیر ...... اور مطلق ...... حقوق قرار دیتا ہے، تو کئی سوال ایسے جنم لیتے ہیں جن کا جواب انسانی بصیرت کے بس میں معلوم نہیں ہوتا۔

مطلق بنیادی حقوق انسانی کے بارے میں سب سے پہلے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ حقوق انسان کو انسان ہونے کی بنیاد پر حاصل ہوتے ہیں یا محض زندہ ہونے کی بنیاد پر؟ یعنی یہ کہ ان حقوق کی بنیاد زندگی ہے یا انسانیت؟

اگر ان کی بنیاد زندگی ہے تو پھر یہ حقوق ساری زندہ چیزوں کے ہونے چاہئیں۔

جیسا کہ بقول ہے وُڈ (Heywood) ٹوم ریگن (Tom Regan) نے اپنی کتاب The Case For Animal Rights میں لکھا تھا کہ:۔

...all creatures that are the subject of life qualify for rights.(1)

اور اسی بنیاد پر مغرب میں حیوانوں کے حقوق کی تحریک جاری ہے۔

لیکن الجھن یہ ہے کہ ان حقوق کو مطلق Absolute اور بنیادی Fundamental مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ:

(i) اگر زندگی حقوق کی بنیاد بنتی ہے تو پھر سب زندہ چیزوں کو حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

(ii) پھر اگر سب کی زندگی ایک جیسی ہے تو سب کے حقوق ایک طرح ہوں۔ اگر زندگی مختلف ہے تو حقوق مختلف ہونگے۔

---

(1) Heywood, Political Ideas And Concepts, p-145

چونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ زندگی کئی قسم کی ہے تو حقوق بھی کئی قسم کے اور مختلف ہونے چاہئیں۔یعنی حقوق کی مساوات چہ معنی؟......

(iii) اگر مختلف ہونا ضروری ہے تو ان مختلف حقوق کا تعین کون کرے گا؟ خودا بھی زندہ چیزوں کی درجہ بندی مکمل نہیں ہوئی تو حقوق کی درجہ بندی کیسے ہوگی۔اور یہ کہ:

(iv) اگر درجہ بندی ہوگئی تو یہ مطلق کیسے رہ جائیں گے؟

(v) اور اگر تعین ممکن ہو تو زمینی زندگی کے بارے میں ہوگا یا آبی مخلوق کے بارے میں؟ اور فضائی مخلوق کا کیا بنے گا؟

زمینی مخلوق کو لے لیں۔اس میں سے بھی گھریلو پالتو جانور کتے سے شروع کرتے ہیں لیکن اگر کتے کے حقوق کا تعین ہو گیا تو ان جانوروں کے حقوق کا کیا ہوگا، جن کا گوشت، کتے کو پیش کیا جاتا ہے؟

(vi) اگر ان حقوق کو صرف مویشیوں اور پالتو جانوروں تک محدود کر لیا جائے (بامر مجبوری) تو پھر یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ ان حقوق کا تعلق پھر خاص مقام رکھنے والی، زندہ چیزوں سے وابستہ ہو گیا اور اس طرح یہ عالمگیر، بنیادی اور مطلق نہیں رہیں گے۔

(vii) پھر جن مخصوص زندہ چیزوں کو یہ حقوق دیئے جائیں گے ان میں بھی مساوات اور برابری ایک سوالِ لا جواب بن جائے گی۔

مثلاً انسان کے لیے عبادت کا اظہار خیال کا اور حصول تعلیم کا حق ہوتا ہے۔ کیا جانوروں کو بھی ایسے ہی حقوق حاصل ہونگے؟

(viii) ...... یہ الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔جب خود انسان کو بھی جانوروں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے۔جانور Social ہوتے ہیں اور انسان بھی، انسان سماجی حیوان تو تھا ہی اب وہ سیاسی حیوان بھی ہے اور اس پر جدید انسان کو اصرار بھی ہے جیسا کہ لیو باخ (Leo Bauch) اپنی مشہور کتاب، سیاسی حیوان میں لکھتا ہے:۔

Our nature is inevitably social,and so, "poltitcal animal

" defines us as we are and must be (1)

(ix) ایسی صورتحال میں انسان سمیت تمام جانوروں کے حقوق کی تعیین کا مسئلہ بہت گنجلک ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زندہ رہنے کے حق کو لیجیے۔ (ا) انسان کو قتل کرنے والے انسان کو بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اس بنیاد پر قتل کی سزا ختم کر دی جانی چاہیے۔ (ب) اگر اس لیے نہیں ختم کی جاسکتی کہ اس نے بھی خود مقتول کا حق تلف کیا ہے تو پھر یہ اصول اب انسان پر، دیگر جانوروں کے تناظر میں لاگو کریں تو انسان کئی جانوروں کو اپنے مقاصد اور ضروریات کے تحت قتل کرتا یا مارتا رہتا ہے۔...... اور یہ ایسا ''جرم'' بنتا ہے جس سے کرہ ارض کا کوئی انسان مبرا نہیں ہے۔ تو کیا پھر تمام انسان قتل کر دیئے جائیں؟......

اگر زندہ رہنے کے حق کے علاوہ دیگر حقوق برابری کی سطح پر تمام جانوروں کے لیے مہیا کرنے ہوں تو وہی الجھن برقرار رہتی ہے کہ مچھر کے مقابلے میں انسان کے، اور انسان کے مقابلے میں مکھی کے حقوق کا تعین کیسے ہوگا؟......

(x) یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ایک قاتل کو سزا دی جاسکتی ہے اسی طرح ایسے جانور کو مارا جاسکتا ہے جو نقصان دہ ہو اور اس طرح (مثلاً) تمام جراثیم کش ادویات کا استعمال درست قرار پا جائے گا۔ لیکن (ا) ان کے استعمال سے گناہ گار اور بے گناہ کو ایک جیسی سزا دینے کا قصور کس کے سر جائے گا اور بے گناہوں کی زندگی لینے کا ''حق'' استعمال کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ (ب) پھر یہ تعین کیسے ممکن ہوگا کہ دوسرا جانور ''نقصان دہ'' ہونے کے دائرے میں کب داخل ہوا؟ (کہ اس کو مارنے کا جواز پیدا ہو!) (ج) اور یہ کہ کس حد تک نقصان دہ ہونے کی سزا کے طور پر اس سے زندگی کا حق چھینا جاسکتا ہے؟...... اس طرح کے منفرد اور ناممکن پیمانے کون ایجاد کرے گا کہ ایک بھونکتا ہوا کتا، کس لمحے کاٹنے کا ارادہ مکمل کر کے حملہ آور ہوا؟ اور خود کاٹے

---

(1) Political Animal, p-IX

جانے والے کے حقوق کی خلاف ورزی، کہاں کہاں سے ہوئی ؟............

یہ تو سارے سوال اس صورت میں ہیں جب آپ نے انسان کو ایک جانور مانا اور دیگر جانوروں کی طرح اس کے حقوق کا مسئلہ درپیش ہوا............

(xi) سوالوں کا ایک اور سلسلہ وہ ہے جو انسان کو انسان مان لینے کے بعد اس کے حقوق کی تعیین کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔

یعنی یہ کہ ایک انسان کب 'Human' کہلانے کا مستحق بنتا ہے جب کہ وہ ہیومین رائٹس کا مستحق ہو سکے؟ پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے بعد!

(ا) اگر پیدائش سے پہلے ہی وہ حقوق کا حق دار ہو جاتا ہے اور ہر زندہ جسم کو ان حقوق کا مستحق مانا جائے تو اسقاط حمل (Abortion) کے ''حقوق'' کی کیا حیثیت ہے؟ ......(ب) اگر پیدائش کے بعد ہیومین کہلا سکتا ہے تو اسقاط حمل کو جائز قرار دینے کے لیے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ بچہ پیدا ہونے سے، پہلے مردہ ہوتا ہے یا یہ ماننا پڑے گا کہ زندگی مقدس نہیں ہے اور حقوق کا تعین صرف زندگی کے ساتھ نہیں ہوتا، زیادہ دیر کی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے ماں کی زندگی زیادہ قیمتی ہے یا یوں کہنا پڑے گا کہ جو دنیا میں پہلے آیا ہوا ہے، اسے بچانا حقوق کے دائرے میں داخل ہے اور اس کی آزادی زیادہ مقدم ہے بہ نسبت اس کے جس نے ابھی یہ ''زندگی'' شروع ہی نہیں کی!!!

(xii) یہ الجھن یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے دوبارہ شروع ہو جاتی ہے کہ آیا حقوق کا تعلق بلوغت اور شعور کے ساتھ ہے یا ہر پیدا ہو جانے والے انسان کے حقوق اس کی زندگی کے پہلے دن سے ہی شروع ہو جاتے ہیں؟......

(ا) اگر پیدائش سے ہی حقوق شروع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ تمام حقوق بھی ہر بچے کو شروع سے دینا پڑیں گے جن کو بلوغت کے بعد مانا جاتا ہے مثلاً الگ رہنے کا حق، شادی کا حق وغیرہ......(ب) اگر بچے کے اپنے حقوق ہیں اور بالغ کے اپنے، تو ان

حقوق کے مطلق اور آفاقی ہونے کی تھیوری غلط ہوگئی اور حقوق کا تعلق شعور سے وابستہ ہو گیا۔ اس لیے کہ بچہ اپنے حقوق کا تعین خود نہیں کرسکتا۔ کسی باشعور کو یہ تعین کر کے دینا ہو گا۔ (ج) یوں اگر حقوق کی تعیین کی بنیاد، شعور اور بلوغت کو بنایا جائے گا تو پاگلوں کے حقوق کا کیا بنے گا؟......

(xiii) اس کے ساتھ ان حقوق کی جنس کے لحاظ سے تخصیص کا سوال بھی موجود ہے۔ آیا یہ حقوق مردوں کے لیے عالمگیر اور مطلق ہیں یا ایسے ہی عورتوں کے بھی حقوق ہیں؟ (ا) اگر عورت اور مرد برابر ہیں تو ایک جیسے حقوق ہونے چاہییں۔ یعنی اگر عورتوں کو میٹرنٹی لیو ملتی ہے تو مردوں کو بھی ملنی چاہیے۔ یا دوسرے لفظوں میں مردوں کو نہیں ملتی تو عورتوں کو بھی نہیں ملنی چاہیے۔ (ب) اگر یہ کہا جائے کہ مردوں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مرد اور عورت برابر نہیں ہیں (ضرورت اور تقاضوں کے لحاظ سے) یا پھر یہ کہ حقوق ایک جیسے نہیں ہو سکتے!

اگر اول الذکر حقیقت کو تسلیم کرلیں تو آزادی اور مساوات کے دعوے بے ثبات ہو جائیں گے اور اگر تو مؤخر الذکر کو تسلیم کرلیں تو بنیادی حقوق کا فلسفہ تبدیل کرنا پڑ جائے گا؟؟؟

یہ اور اسی طرح کی اور الجھنیں ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ اس کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ حقوق وفرائض کا وہ پیمانہ مان لیا جائے (اور اس کی ادائیگی کی فکر کی جائے) جو خالق کائنات نے خود بالوضاحت وحی کے ذریعے ہم تک پہنچا دیا ہے اور اپنے نبیوں کے ذریعے اس کی عملی تصویر دکھا دی ہے۔ انصاف کے قریب ترین پہنچ جانے کا یہی ایک راستہ ہے کیونکہ انسانوں کو انصاف تک ہی پہنچانے کے لیے اور انسانوں کے ان معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے جن میں وہ اختلافات اور الجھنوں کا شکار رہتا ہے، نبی بھیجے گئے ہیں:۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط﴾۔(1)

اللہ کی آخری کتاب اور آخری نبی ﷺ کے بیان کردہ حقائق پر ایمان لانے کے بعد انسان کو صراط مستقیم مل جاتا ہے جو اسے حقوق وفرائض کا متناسب ومتوازن اصول اور حکمت عملی عطا کرتا ہے۔اس اصول کی شاہ کلید یہ ہے کہ کائنات کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہے جو تمام چیزوں کی تخلیق اور تقدیر کے فیصلے کرتا ہے:۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾(2)

وہ حقوق کی تعیین اور بہم رسانی کا اہتمام بھی کرتا ہے اور وہی کر سکتا ہے (جو انسان کے بس میں نہیں!)

﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰىo وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰىo﴾(3)

وہی اس سلسلے میں ہونے والی خلاف ورزیوں کا حساب وکتاب بھی رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے:۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِo﴾(4)

اس حوالے سے پیمانے، معیار اور طریقے اس کے اپنے ہیں اور ان کا اطلاق وہ حکمت اور انصاف سے کرنے کا اسلوب جانتا ہے:۔

﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌo﴾(5)

انسان یا کوئی اور ہستی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ اس وسیع کائنات کا وہ

---

(1) البقرۃ:213، (2) الفرقان:2، (3) الاعلیٰ:3، (4) البقرۃ:202،
(5) الشوریٰ:12

تنہا مالک وحاکم ہے۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ.........﴾(1)

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ط﴾(2)

ان حقائق کی روشنی میں دیگر معاملات کی طرح مذکورہ بالا مسائل کو بھی رب کائنات پہ چھوڑ دینا انسان کی ضرورت اور مجبوری ہی نہیں، ان مسائل کا صحیح حل بھی ہے اور حکمت ودانائی کا تقاضا بھی!۔

جہاں تک معاملہ ہے انسان کا اپنا، تو اس سلسلہ میں وضاحت موجود ہے کہ:
انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی بنیاد پر اختیارات اور ذمہ داریوں کا مجموعہ ہے جس کے ساتھ حقوق وفرائض کا توازن وابستہ ہے:۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ م بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَo﴾(3)

﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾(4)

بنی آدم کو تکریم اللہ نے عطا کی ہے اور تمام چیزیں اس کے لیے مسخر کردی گئی ہیں۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ......﴾(5)

یہ تعظیم اور تسخیر، اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے نظام کی تنفیذ اور انصاف قائم کرنے کی بنیادوں پر عطا ہوتی ہے، اور ان شرائط کے پورا کرنے پر انسان کو ترجیحی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ انسان کو اپنی حیثیت ومقام اور اپنے انجام کو سامنے رکھ کر اپنے حقوق کا حصول اور اپنے اختیارات کا استعمال ممکن بنانا چاہئے۔ کثرت ہوس اور ہوس کثرت سے احتراز کرتے ہوئے اعتدال کی راہ پر قائم رہنا چاہیے کہ اس کے خالق کو

(1) البقرۃ:255 (2) فاطر:44، (3) یونس:14، (4) الملک:2، (5) الاسرآ:36

حد سے گذرنے والے پسند نہیں ہیں اور اس نے ایک دن تمام اختیارات اور حقوق کا حساب لینا ہے:

﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝﴾ (1)

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا ۝﴾ (2)

یہ جاننے کے لئے کہ فکرِ اسلامی میں، حقوق کا تصور، ان کی بنیاد اور معیار کیا ہے، ضروری ہے کہ لفظ حق (جس کی جمع حقوق آتی ہے) کی تشریح، قرآن مجید میں آنے والے، اس لفظ کے مفاہیم کی روشنی میں کی جائے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں لفظ ''حق'' کثرت کے ساتھ، کئی معنوں میں بیان ہوا ہے (3)۔ ذیل میں ہم صاحب مفردات کی تحقیق کا خلاصہ، قرآن پاک کی آیات کے حوالوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) مطابقت، موافقت اور موزونیت:

﴿مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ﴾

(۲) مبنی برحق تخلیق اور تخلیق کرنے والی ذات:

﴿فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ......﴾

(۳) گمراہی اور باطل کی ضد:

﴿......فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝﴾

(۴) سچ اور درست (وقوع اور عمل پذیر ہونے کے لحاظ سے)۔

﴿كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ......﴾

(۵) لازم، ضروری اور واجب:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾۔ (4)

---

(1) التکاثر:8، (2) الاسرآ:36، (3) راغب اصفہانی، المفردات:125،

(4) یونس:5، 32، 33، 103

قرآن مجید کی درج بالا آیات کی روشنی میں لفظ حق کے مفہوم کے یہی وہ مختلف پہلو ہیں، جو مفسرین کرام نے بھی بیان کیے ہیں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر طبری اور الکشاف)......(1)

مندرجہ بالا آخری سطر میں درج مفہوم کے لحاظ سے، سیاسی زبان میں حقوق کا لفظ، ان لوازمات اور واجبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی معاشرے اور فرد کے درمیان باہم رابطہ و تعلق کی بنیاد ہوتے ہیں۔ان کا ایک حصہ ہر فرد معاشرے سے طلب کرتا ہے اور دوسرا حصہ وہ جو معاشرے کو فرد سے مطلوب ہوتا ہے۔

اس دوگونا سلسلے کو حقوق و فرائض کے دو اجزاء میں تقسیم کیا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔ جہاں تک حقوق و فرائض کی ادائیگی کا تعلق ہے تو فرائض ادا کرنے کی باری پہلے آتی ہے اور حقوق حاصل کرنے کی بعد میں......دین اسلام فرائض کی بجا آوری کے ساتھ جہاں عدل و احسان (یعنی ادائیگی کی اعلیٰ ترین صورت) کی شرط لگاتا ہے وہاں مزدور کی اجرت (کا حق) اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی تاکید کرتا ہے۔اس طرح حقوق و فرائض باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ویسے بھی اردو زبان کی یہ ترکیب یعنی حقوق و فرائض بظاہر دو الگ چیزوں کو یکجا کرنے والی معلوم ہوتی ہے جبکہ عربی زبان میں حق اور فرض کئی معنوں میں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں کیونکہ قرآن نے فرض اور فریضہ (جس کی جمع فرائض ہوتی ہے) کا لفظ بھی لازم، متعین، مقرر، ضروری اور واجب الاداء کے معنوں میں (جو کہ لفظ ''حق'' کے معانی بھی ہیں) استعمال کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَدْفَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً..........﴾(2)

(1) الطبری، جامع البیان:10/86،114،116، 11/116
الشوکانی، فتح القدیر:2/402، الزمخشری، الکشاف:344،345

(2) البقرة:237

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اصول عمرانی کے لحاظ سے حقوق و فرائض ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے واجبات کو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تقسیم کیا ہے جن کی بجا آوری کے ساتھ دنیا اور آخرت کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت فراہم کی ہے۔

دینِ اسلام، حقوق و فرائض کو نہ صرف مربوط رکھتا ہے بلکہ ان کی ترجیحات کا تعین بھی کرتا ہے۔ جن معاشروں میں حقوق و فرائض کی ادائیگی میں عدم توازن در آتا ہے وہاں فتنہ و فساد ایک لازمی نتیجے کے طور پر، انسانی اجتماعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ گویا اپنے معاشروں کی تعمیر و تخریب میں بنیادی کردار، انسان کا اپنا ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض بحسن و خوبی ادا کرتا رہے تو دوسروں کے حقوق بطریق احسن ادا ہوتے رہتے ہیں اور بنیادی حقوق کا واویلہ نہیں مچتا۔ لیکن صورتحال اس سے متضاد ہو تو پھر ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ O (1) کی عملی صورت سامنے آجاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کے حقوق و فرائض کا تعین اس کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ کسی کے مقام و مرتبہ کا تعین اس کے مقصدِ زندگی یا مقصدِ وجود سے ہوتا ہے۔ یہ مقصدِ وجود یا مقصدِ تخلیق وہی متعین کرتا ہے جو خالقِ حقیقی ہے۔ خالق و مالک جب تخلیق کرتا ہے تو مقصدِ تخلیق کے ساتھ ذمہ داریوں کا بھی تعین فرماتا ہے۔ یہی ذمہ داریاں فرائض ہیں۔ ایک کے فرائض دوسرے کے حقوق اور دوسرے کے فرائض پہلے کے حقوق قرار پاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آجائے تو بے شمار مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

جس انسانی معاشرے کے افراد میں سماجی فرائض سے غفلت برتنے کا رویہ

---

(1) الروم: 41

عام ہو جائے وہاں بنیادی حقوق کے مطالبے عام ہو جاتے ہیں۔ جب انسان اپنے قدرتی اور فطری فرائض سے ''آزادی'' کے جنون میں گرفتار ہو جائے تو پھر ایک طرف تو اس کے دوسرے انسانی بھائیوں کے حقوق سلب ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کے اپنے بنیادی حقوق کا مطالبہ بے بنیاد، بے معنی اور غیر منطقی ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اگر اس کے مفادات مکمل نہ ہوں تو وہ اجتماعیت کا دشمن بن کر فساد کا باعث بن جاتا ہے اور اگر یہ حقوق پورے ہونے لگیں تو وہ انفرادیت پسند، غیر جانبدار اور بے حس ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ معاشرتی خودکشی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ جسے کچھ مل جائے وہ بے نیاز ہو کر بے حس ہو جاتا ہے اور جسے نہ ملے وہ محروم رہ کر مایوس! دل سینہ بے نور میں محروم تسلی!

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو حقوق و فرائض کی اُس ہدایت پر مطمئن ہو گئے جو انہیں خالقِ ارض و سماء نے اپنے محبوب انبیاء و رسل کے ذریعے عطاء کی ہے۔ وہ اس نعمت سے سرفراز ہو جاتے ہیں جو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر تمام ہو چکی ہے، ایسے ہی وہ لوگ ہیں جو بے یقینی، بے چینی اور بے عملی کے گورکھ دھندوں سے نکل کر ایمان، قناعت، صبر، توکل اور امید کی شاہراہ پر آ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تشکیک، ناامیدی اور فکری مغالطوں کے سرابوں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی اور سلامتی کی چھاؤں میں آ جاتے ہیں۔

﴿يَـٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى ۝ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ۝﴾

(الفجر: 27 تا 30)

ترجمہ: اے جان اطمینان والی، لوٹ چل اپنے رب کی طرف! تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پس شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں!

کتابیات

تفاسیر

۱۔ آلوسی، شہاب الدین محمود، روح المعانی، دارالفکر، بیروت۔۱۹۹۷ء

۲۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن، زادالمسیر، مکتب الاسلامی، بیروت۔۱۹۶۴ء،

۳۔ ابن العربی، محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، دارالمعرفۃ، بیروت۔۱۹۵۸ء

۴۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، مکتبہ الملکیہ۔۱۹۴۸ء

۵۔ الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔۱۹۹۰ء

۶۔ الزمخشری، محمود بن عمر، الکشاف، مطبعۃ الاستقامۃ، مصر۔۱۹۴۶ء

۷۔ الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۳۴۹ھ

۸۔ الطبری، محمد ابن جریر، جامع البیان عن تاویل ای القرآن، مصطفیٰ البابی، مصر۔۱۳۴۹ھ

۹۔ القرطبی، محمد بن احمد، الجامع لا حکام القرآن، دارالکتب العربیہ، مصر۔۱۹۶۷ء

۱۰۔ سید مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القران، لاہور۔۱۹۹۱ء

کتب تاریخ وفلسفہ

۱۔ اقبال، کلیات، الفیصل۔اردو بازار، لاہور۔۱۹۹۵ء،
بانگ درا، ضربِ کلیم، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور۔۱۹۴۹ء

۲۔ امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست، انجمن خدام القرآن، لاہور۔۱۹۷۷ء

۳۔ البلاذری، احمد بن یحیٰ، فتوح البلدان، نفیس اکیڈمی، کراچی۔۱۹۸۶ء،

۴۔ حسن صعب، علم السیاسۃ بیروت۔۱۹۶۶ء

۵۔ حسن عسکری، جدیدیت، نقوش پریس، لاہور۔۱۹۷۹ء

۶۔ حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی۔۱۹۸۷ء
خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔۱۴۰۱ھ

۷۔ سید محمد سلیم، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور۔۱۹۸۹ء

۸۔ شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔۱۹۵۷ء

۹۔ صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی، عزیز پبلشرز، لاہور۔۱۹۷۷ء

۱۰۔ عبدالرؤف ملک، مغرب کے عظیم فلسفی، ادارہ ادبیات نو، لاہور۔۱۹۶۴ء

۱۱۔ الفارابی، ابونصر محمد، آراء اہل المدینۃ الفاضلہ، بیروت۔۱۹۵۹ء

۱۲۔ الماوردی، علی بن محمد، الاحکام السلطانیہ، مصر۔۱۹۶۰ء

لغات

۱۔ ابن منظور، جمال الدین، لسان العرب، بیروت۔ ۱۹۵۶

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۳۔ بطروس البستانی، محیط المحیط، بیروت۔ لبنان۔ ۱۹۷۷ء

۴۔ راغب اصفہانی، حسن بن محمد، المفردات،
دارالفکر، بیروت۔ مطبعۃ خدمات چاپی مصر طبع ثانی۔ ۱۴۰۴ھ

۵۔ زین العابدین، بیان اللسان، مکتبۂ علمیہ، میرٹھ۔ ۱۹۵۰ء

۶۔ فیروز آبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، مصطفیٰ البابی، مصر۔ ۱۹۵۲ء

۷۔ لوئیس معلوف، المنجد، بیروت۔ ۱۹۵۱ء

۸۔ مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس، دارالفکر، بیروت۔ ۱۹۹۴ء

۹۔ المعجم الوسیط، دارالفکر، بیروت، س۔ ن۔ م

۱۰۔ الموسوعۃ العربیۃ المیسرۃ، قاہرہ۔ ۱۹۶۰ء

انگریزی کتب

PHILOSOPHY

1. Allama Iqbal, ***The Reconstruction Of Religious Thought In Islam***, London - 1965.
2. Anthony Giddens, ***Beyond Left And Right***, Oxford - 1995.
3. Aristotle, ***Politics***, (Tr Benjamine Jowett), New York - 1943.
4. Edward Meckesney, ***Masters of Political Thought***, London-1947.
5. Hearnshaw, ***The Social And Political Ideas Of Some Great Thinkers Of The Renaissance And The Reformation***, New York-1949.
6. Henry Thomas, ***Great Philosophers***, New York - 1946.
7. Keith Dixon, ***Freedom And Equality,*** London - 1986.
8. Leo Bouch, ***Political Animal,*** Amherst - 1981.
9. Machiavelli, ***The Prince***, Beruit - 1966.
10. Maurant J. A., ***Problems of Philosophy***, New York - 1964.
11. Northrop, ***The Meeting Of East And West***, New York - 1953.
12. Philip Hammond, ***The Sacred In A Secular Age,*** California - 1985.
13. Robert Briffault, ***The Making Of Humanity***, London - 1928.
14. Roger Eatwell, ***Contemporary Political Ideologies***, U.S.A. - 1993.
15. Roscenthal, ***Political Thought In Medieval Islam,*** Camberidge University Press - 1958.

POLITICAL SCIENCE & SOCIAL STUDIES

1. Andrew Hewood, ***Political Ideologies,*** London-1998
2. ***Polilltical Ideas & Concepts.***
3. Anthony Giddens, ***The Third Way***, Camberidge-1998
4. Brian R. Nelson, ***Western Political Thought***, New Jersey- 1982.
5. Carl Becker, ***Modern Democracy***, New York-1941
6. David Held, ***Models of Democracy,*** Camberidge-1987.
7. Eduard Zeller, ***Outlines Of the History Of Greek Philosophy,***Tr. Palmer, London - 1950.
8. Emile Durkheim, ***The Elementary Forms Of The Religious Life,*** London - 1982.
9. Ernest Barker, ***Greek Political Theory,*** London - 1967
10. Gibbon, ***The Decline And Fall Of The Roman Empire***, Modern Library, New York.
11. Givenni Sartori, ***The Theory of Democracy Revisited,*** New Jersy- 1987.
12. Graeme Duncan, ***Democractic Theory And Practice,*** Camberidge University Press - 1983.
13. Herodotus, ***History Of The Persian Wars***, Tr. Rawbinson, New York - 1942.
14. Jack Lively, ***Democracy***, Oxford-1975.
15. J. Macgrager, J. Walter, ***Government By The People***, New York - 1953.
16. Joad, ***Modern Political Theory***, Oxford - 1953.
17. John Burkein, ***Is Democracy Possible***, Basil Blackwell, Oxford-1985.

18. John Dunn, ***Democracy - The Unfinished Journey***, Oxford University Press - 1989.

19. Laski, H. J., ***AGranmer of Politics***, London - 1934

20. ***An Introduction To Politics***, London - 1960.

21. ***The State In Theory And Practice***, Unwin London-1936.

22. Leonard Tivy, ***The Nation State***, Martin Roberston Oxford-1981.

23. Maurice De Wulf, ***Philosophy And Civilization In The Middle Ages***, New York - 1922.

24. Michael Stewart, ***Modern Forms of Government***, London-1959.

25. Noberto Bobio, ***Democracy And Dictatorship***, Tr. Peter Kennealy, Polity Press - 1997.

26. Ortega Gasset, ***The Revolt Of The Masses***, New York, 1932.

27. Philip Hitti, ***The Origins Of The Islamic State***, Beruit - 1966

28. ***History Of The Arabs***, New York - 1968.

29. Robert Dahl, ***Democracy And Its Critics***, Yale University, 1989.

30. ***Modern Political Analysis***, U.S.A. - 1991.

31. Sabine, ***A History Of Political Theory***, Japan - 1981(4th Edition)

32. Soltau, ***An Introduction To Poliltics***, Longman, London - 1968.

34. William Andrews, ***European Political Institutions***, New York-1964.

35. Will Durant, ***Caesar And Christ***, New York - 1944.

36. ***The Story Of The Civilization***, New York - 1955
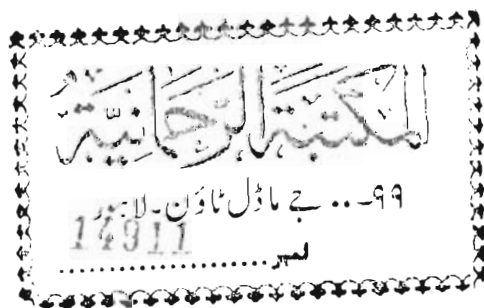
جمہوریت اپنے تصور اور عملی مظاہر کے لحاظ سے مختلف اقوام اور ممالک میں مختلف روپ رکھتی ہے۔ کسی بھی مہذّب یا متمدن ریاست کے لیے طرزِ حکومت ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ یونان کے مفکرّین میں سے افلاطون نے تو ''ریاست'' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ یورپ میں تحریکِ احیائے علوم کے نتیجے میں مملکتیں کچھ وقت تک تو شہنشاہیت اور جمہوریت کے امتزاج سے ہم آہنگ رہیں اور پھر خالص لادینی جمہوریت کے راستے ایک مادّی تہذیب اور الحادی تمدّن کی آئینہ دار بن گئیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ جیسے مفکّر نے جمہوریت کی اس طرزِ حکومت کو افراد کے اخلاقی وزن اور وِژن کی بجائے محض سرشماری پر محمول کیا ہے۔ اس نوعیّت کی جمہوریت کے مفاسد سے خود یورپ بھی نالاں دکھائی دیتا ہے۔

گذشتہ تین صدیوں میں خلقِ خدا نے جمہوریت کی اس کشمکش میں جہاں بے خدا اشتراکیت کے عبرت انگیز مناظر کا مشاہدہ کیا، وہاں اسے لادین سرمایہ دارانہ معیشت پر مبنی مغرب کے جمہوری نظام کے فساد انگیز اور اخلاق سوز مشاہدات کا بھی سامنا ہے۔ افراط وتفریط کے اس ماحول میں صرف میثاق مدینہ کے ماڈل پر مبنی اسلامی ریاست کا شورائی نظام ہی عالمی سیاست کے اس بحران کا تدارک کر سکتا ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام کے ارتقا اور اُس کے مفاسد پر ڈاکٹر مستفیض علوی نے جس بالغ نظری اور انصاف پسندی سے قلم اٹھایا ہے، وہ علمی تحقیق کا ایک نادر شہ پارہ ہے۔ دنیا کے غیر عادلانہ نظام اور ماحول میں جس تعمیری اور مبنی برعدل ریاست وقیادت کی ضرورت ہے، اُس کے خدّ وخال کو فاضل محقق نے کتاب وسنّت کی روشنی میں بڑی اجتہادی بصیرت کے ساتھ علمی منہج کے جدید اسالیب اور مستند مراجع اور مصادر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ مصنف اسلامی تصورِ حیات کا ایک واضح نقشہ اپنے ذہن میں رکھتے ہیں، جس کے باعث اسلام اور جمہوریت کے تقابلی مطالعے میں انہوں نے غیر جانبداری کی ایک ایسی علمی اور تحقیقی روایت کا تحفظ کیا ہے، جس کے باعث اس تحقیقی لوازمے کا مطالعہ قانون، تاریخ، سیاسیات اور اسلامیات کے طلبہ، اساتذہ، علما اور اہلِ دانش کے لیے ان شاءاللہ یکساں مفید ہوگا۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر، بیت الحکمت، لاہور

Title Design By: Agah Nisar 7210011

دسٹری بیوٹرز
کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
کتاب سرائے
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ISBN 969-8773-02-9

کیا اسے 'مقاصد کی آڑ میں شرع کو معطل کرنا' کہا جا سکتا ہے؟

کل کو نظر انداز کر کے جزوی اصلاح کی غلطی سمجھنے کے لیے اسلامی قحبہ خانہ کی مثال بہت واضح ہے۔ اس سلسلے میں مثالوں کا ایک دفتر پیش کیا جا سکتا ہے مگر خوفِ طوالت کی بنا پر اسی ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ سمجھنے کے لیے اس میں بہت سا مواد موجود ہے۔ فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ معاملات کے باب میں اعتبار عواقب و نتائج کا ہوتا ہے نہ کہ معاملے کی ظاہری ساخت کا (سرخسی جلد ۷)۔ مسند امام احمد (۱۸۴) میں سالم بن عبداللہ کی روایت کا مفہوم ہے کہ غیلان بن سلمہؓ نے حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں جب اپنی بیویوں کو طلاق دے کر اپنا مال بھائیوں میں تقسیم کر دیا تو حضرت عمرؓ نے اسے بلا کر کہا کہ تمہیں اپنی بیویوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور تقسیم شدہ دولت واپس لینا ہوگی بصورت دیگر میں (اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے) تمہاری بیویوں کو تمہارا وارث بناؤں گا۔ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوبصورت مگر بانجھ عورت سے نکاح کی تین مرتبہ اجازت طلب کی، آپ نے تینوں مرتبہ منع فرما دیا (ابوداؤد ۲۰۵۳، نسائی ۳۲۲۹) حالانکہ بانجھ عورت سے نکاح حرام نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ مقاصدِ شریعہ کی کلیت کو متاثر کرتا ہے لہٰذا اجازت نہ دی گئی۔ درج بالا مثال کی طرح ان چند روایات ہی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ یہ موضوع بذاتِ خود ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے (۵)۔ اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کے لیے اس وقت تک کوئی مثبت اسلامی حکمتِ عملی تیار نہیں کی جا سکتی جب تک تجزیے کا نقطہ ماسکہ جزوی تفصیلات نہیں بلکہ 'نظام' نہ بن جائے کیونکہ جزئی نقطہ نظر سے محض معاہدات کی ظاہری ساخت تبدیل کی جا سکتی ہے نہ کہ واقعیت کی جکڑ بندیاں۔

اس مقام پر یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری' کے مصداق خود مجوزین کے گھر سے 'کل' کی روشنی میں تجزیہ کرنے کے حق میں ثبوت پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب 'مقاصد شریعت' کا باب نمبر ۶ (مقاصد شریعت کی روشنی میں معاصر مالیات کا جائزہ) چشم کشا حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجوزین کے ہاں ڈاکٹر صاحب کی حیثیت رواداولین (pioneers) اور 'استاذ الاساتذہ' کی ہے (کیونکہ خود مولانا تقی عثمانی بھی اسلامی معاشیات میں انہیں اپنا استاد مانتے رہے ہیں)۔ چونکہ ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ درج بالا اصول خود مجوزین کے نزدیک بھی معتبر ہے لہٰذا ہم یہاں چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، تفصیلات کے لیے کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

- چنانچہ ڈاکٹر صاحب ایک بیع کے اندر ایک سے زائد معاہدات جمع کرنے کے عواقب کے بارے میں فرماتے ہیں: